چڑیا گھر
(افسانے)
احمد جاوید

(افسانے)

احمد جاوید

گندھارا

ضابطہ

نام کتاب : چڑیا گھر

مصنف : احمد جاوید

قیمت : 99 روپے

تعداد : ایک ہزار

اشاعت اول : 1996ء

طابع : زاہد بشیر پرنٹرز
لاہور

ناشر

گندھارا بکس

پوسٹ بکس نمبر 665 راولپنڈی

والدہ مرحومہ کے نام

فہرست

ابتدائیہ

.... پہلی کہانی کی اشاعت تو ۱۹۶۶ء میں ہوئی تھی لیکن اسے متروک ہی سمجھتا ہوں۔ افسانہ نگاری کے جو رویے اور رجحانات ۱۹۶۰ء میں مقبول ہوئے اس روایت میں جو کہانی لکھی اس کا عنوان تھا "............ جب اس نے سنا" .... اور یہ کہانی پنجاب یونیورسٹی لاہور کے مجلّے "محور" ۷۰ - ۱۹۶۹ء میں چھپی .... بعد کے زمانے میں جو کچھ لکھا وہ اسی کی بدلتی ہوئی صورتیں ثابت ہوا۔

۱۹۷۰ء کے عشرے میں سیاسی ماحول میں خاصی ہلچل پیدا ہوئی جس نے قریب قریب تمام اذہان کو متاثر کیا۔ خصوصاً" سقوط ڈھاکہ کا المیہ آنے والے دنوں کے لئے جو تشویش پیدا کر گیا وہ اس زمانے کے ادب میں بھی جابجا دکھائی دیتا ہے۔ "ایک گمشدہ شہر کی داستان" پاکستان کے دو لخت ہونے کے بعد اور شاید اس کے اثر میں لکھی تھی۔ ایک شہر تمثیل بنا اور پھر یہ تمثیل دیر تک میرے ہمراہ رہی اور اب بھی اکثر جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

۱۹۷۷ء میں جب ایک مرتبہ پھر مارشل لاء نافذ ہوا تو شعر و ادب کو ایک ایسا زرخیز موضوع ہاتھ آگیا جو علامتوں سے بھرا تھا۔ اس زمانے میں ۱۹۸۳ء تک میں نے جو کہانیاں لکھیں ان میں سے بیشتر میرے پہلے مجموعے "غیر علامتی کہانی" میں شامل ہیں۔ جن احباب نے اس مجموعے کا مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے محسوس کیا ہوگا کہ بعض کہانیوں میں "حبس" اور اس موسم کے متعلقات کا جابجا ذکر ہے۔ خاص طور پرندے جانور اور ایسے کیڑے مکوڑے جو اس موسم کی پہچان ہوتے ہیں میری کہانیوں کی ماحول سازی میں کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

.... پہلے مجموعے کی اشاعت کے بعد پرندوں جانوروں اور حشرات الارض نے میرے افسانوں کو "کہیں کہیں کا ملا" بھی گھیرے میں لیا ہے اور عنوانات تک میں در آئے ہیں- ایسے ہی عنوانات پر مبنی کچھ کہانیاں اس مجموعے میں اکٹھی کی ہیں .... یہ جنگل کی داستان نہیں ہے کوئی شہراب بھی میرے ہمراہ ہے مگر ذرا اور طرح سے ....

اور آخر میں یوسف حسن کے لئے اظہار ممنونیت کہ جس کی رفاقت اور محبت کے سبب نہ صرف ان میں سے اکثر افسانے لکھے گئے بلکہ یہ مجموعہ مرتب ہوا اور اشاعت پذیر ہوا۔

افسانے

چُوبی

وہ چوہے جو اپنے بل سے پنیر کی بو پا کر نکلے تھے اور ادھر ادھر منڈلاتے پھرتے تھے اس چوہے سے بے خبر تھے جو لیبارٹری کی میز پر ایک آہنی پنجرے میں سائنس دان کے تجربے کا منتظر تھا۔

وہ بلی جو غراتی پھرتی تھی کمرے کے اندر داخل ہونے میں ناکام تھی۔ وہ ایک سوراخ سے باربار اندر جھانکتی اور باربار پلٹتی اور چوہے جو تجربہ گاہ کے اکھڑے ہوئے فرش کے ایک بل میں آباد تھے۔ چوروں کی طرح باہر نکلتے، زمین سونگھتے اور ڈر کر پلٹ جاتے۔

بل سے نکلنے والے چوہوں کے لئے کمرے کی زمین ایک دور تک پھیلی ہوئی وسیع کائنات تھی۔ مگر خطروں سے بھری ہوئی.... بلی کی خشمگیں نگاہیں ہی ایک عتاب نہیں ہوتا اور بھی کئی ان دیکھے اندیشے ہیں جو چوہوں کو اپنے سوراخوں سے زیادہ دور نہیں جانے دیتے مگر کیا کیجئے کہ پنیر کی خوشبو بھی ایسی ظالم تھی کہ وہ بھی تو کسی پل چین نہیں لینے دیتی تھی..... کشش کرتی تھی بلائی تھی.... ایسی خوشبو کہ جس کے آگے ایک مرتبہ تو خود زندگی بھی بے معنی تھی... بے کیف تھی۔ مگر ان چوہوں کی ایسی صلاحیت کہاں تھی کہ وہ یہ بھید پا سکتے کہ لذت کا محور وہ تازہ پنیر کہاں تھا....؟ وہ تو اک خواب تھا..... ایک ان دیکھی دنیا جہاں تک پہنچنا محال تھا..... ان کے حساب میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے اگر میسر ہو..... اور میسر ہو ان دیکھے خطروں سے بچنا...... میز کے اوپر کی دنیا تو ایک تصوراتی ھیولا تھی اور ان کا وہ مقدر نہ تھا جو تجربے کے لئے رکھے ہوئے چوہے کو حاصل تھا۔

سائنس دان نے لیبارٹری کی میز پر جو پنجرہ رکھا تھا وہ ان پنجروں سے مختلف تھا جو اناج کے دشمن چوہوں کو پھانسنے کے لئے گھروں میں رکھے جاتے ہیں اور جن میں بلوں میں چھپے

گندے غلیظ چوہے رزق کے لالچ میں اپنی بے خبری کے ہاتھوں پھنس جاتے ہیں اور ہلاک کردیئے جاتے ہیں

یہ صاف ستھرا پنجرہ صاف ستھرے چوہوں کے لئے بالخصوص بنوایا جاتا ہے اور صاف ستھرے ماحول میں رکھا جاتا ہے...... لیبارٹری کی میز پر رکھے پنجرے میں بند چوہے کو پھانس کر ہلاک کرنا مقصود نہیں ہوتا..... اس کی بھوک' اور اس کی لالچ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے رزق تلاش کرنے کے آداب سے آگاہ کرنااور سیکھنے کی صلاحیت کو جانچنا اور بڑھانا مقصود ہوتا ہے.... بلوں میں چھپے چوہوں کی نسبت اسے یہ سہولت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اپنی غلطیوں سے سیکھ سکے...... اس مقصد کے لئے اسے وقت اور موقع بھی دیا جاتا ہے.... اور احساس تحفظ بھی...

بلوں میں چھپے چوہے کسی کی دلچسپی کا باعث نہیں ہوتے البتہ ان کے سروں پر بلی غراتی رہتی ہے۔ ہلاک کرنے والا پنجرہ پڑا رہتا ہے یا ان کے بلوں میں چوہے مار گولیاں ڈالی جاتی ہیں یا ہلاکت آفریں چھڑکاؤ کیاجاتا ہے......وہ اپنی موت آپ مرجاتے ہیں یا مختلف ذریعوں سے مار دیئے جاتے ہیں۔ انہیں غلطیوں سے سیکھنے کا موقعہ نہیں دیاجاتا..... یا پھر وہ اپنی غلطیوں سے سیکھتے نہیں..... توحیف دنیا کے نقشے پر چوہوں کے لئے بہت سی دشواریاں ہیں۔

ہر چند کہ چوہوں کے لئے بہت سی دشواریاں ہیں مگر لیبارٹری کی میز پر پڑا پنجرے میں بند چوہا اپنے تجربے سے سیکھتا تھااور اس طرح صرف اپنی استعداد اور سائنس دان کے علم میں اضافہ ہی نہیں کرتا تھا خود کو دوسروں میں ممتاز بنانے کی صلاحیت حاصل کرنے کے جتن میں بھی تھا۔

چوہوں کے لئے تربیت کا مرحلہ زیادہ سہل نہیں۔ انہیں ٹامک ٹوئیاں مار کر سیکھنا ہوتا ہے۔.... اس مقصد کے لئے گندے غلیظ چوہوں سے انتخاب نہیں کیاجاتا...... اچھی نسلوں کے صاف ستھرے چوہے ہی کار آمد ہوتے ہیں.... ایسے جو ڈر اور خوف پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے ہیں..... جنہیں رزق کا لالچ اطاعت کرنا سکھائے اورجو فطرت کو فراموش کرنے کا مظاہرہ کریں....کہ اطاعت سیکھنے کے لئے اپنی اصل کو فراموش کرنا بنیادی شرط

ہے۔

تو وہ چوہا جو دوسروں میں ممتاز تھا۔ اس پر تجربے کا آخری دن تھا۔ میز پر رکھے پنجرے کے وسط میں ایک تازہ پنیر کا صاف ستھرا ٹکڑا رکھا گیا۔ پنجرے میں چاروں طرف زگ زیک جالی دار راستوں کا جال بچھا تھا۔ سائنس دان نے روز کی طرح آج بھی سیکھنے والے چوہے کو اس بڑے پنجرے سے نکالا تھاجہاں اس جیسے دوسرے بھی تھے۔ ہتھیلی پہ بٹھایا' پیار سے پچکارا.. کوئی کراہت محسوس نہیں کی اور تجربے والے پنجرے کے دروازے پہ بٹھادیا تھا۔ پہروں کا بھوکا چوہا پنیر کی خوشبو کی لپٹوں میں آکر جھوم گیاتھامگر قدم آگے نہیں بڑھائے تھے۔ اس نے ایک عرصے میں جو تعمیل کرنے کافن سیکھا تھا وہ اس سے منحرف ہونے کے لئے تیار نہیں تھا محض اس پنیر کے لیے جو اسی کے لئے تھا۔ سواس نے انتظار کیا۔ انتظار کیا جب تک کہ سائنس دان کے ہاتھوں میں پکڑی ٹائم واچ کی ٹک ٹک نہ گونجی .... ٹک ٹک گونجی تو وہ جست بھر کے اندر داخل ہواکہ اس آواز میں جادو کی کشش تھی.... یہ اجازت تھی اور عنایت تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تھااور پنیر کی خوشبو نے اسے راستہ دکھایا تھا وہ جھومتا چلا اور گھومتا چلا اس طرح کہ کسی رکاوٹ نے اسے راستے میں نہیں ٹوکا.... تو وہ راہداریوں میں سے بل کھاتاخلاف معمول کسی رکاوٹ سے ٹکرائے بغیر پنیر تک پہنچ گیاتھا..یوں سہولت سے اسے اپنی منزل تک پہنچتے دیکھ کر سائنس دان کے منہ سے خوشی کی چیخ نکل گئی تھی۔ یہی اس کی تمنا تھی' اسی کا وہ عرصے سے منتظر تھا.... وہ کچھ دیر دیوانہ وار رقص کرتارہاتھا.... چوہے نے بھید پالیاتھا۔ اس کے علم میں تمام رکاوٹیں آگئی تھیں اور کھلے ہوئے راستوں کی خبر ہوگئی تھی۔ وہ کھلے ہوئے راستوں پر بغیر کسی جھجک کے جست بھرتااپنی منزل پر پہنچ گیاتھا۔

سائنس دان نے تجربے میں استعمال ہونے والے چوہے کو پچکار کر نکالا تھا' پیار سے اس کی پشت سہلائی تھی اور اسے ایک دوسرے میز پر اپنے سامنے بٹھادیا تھا۔ کچھ دیر اسے محبت سے دیکھتا رہاتھااور پھر کاغذ پنسل سنبھال کر بیٹھ گیاتھا۔

یہ دن کچھ دنوں کے بعد آیا تھا...کچھ دن .... کبھی کل کی بات لگتی ہے کبھی صدیوں

پہلے کا قصہ..... تجربے کا پہلا دن اس چوہے پر کتنا مشکل تھا.....پہلی گھڑی ہمیشہ مشکل ہوتی ہے۔ پہلے روز اسے دروازہ کھول کر جب اندر رکھا گیا تو جہاں رکھا گیا تھا وہ وہیں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ کوئی ڈر جالیوں کے اندر سے جھانکتا تھا۔ وہ دیر تک وہیں بیٹھا رہا تھا مگر پھر اچانک بھول گیا تھا۔ فضا پنیر کی خوشبو سے معطر تھی جس نے مدہوش کیا تھا..... مدہوش ہوا تو اچھل کر چلا تھا مگر پھر اپنی فطرت کیسے بدلتا کہ آخر چوہا تھا۔ ایک مرتبہ پھر عدم تحفظ کا شکار ہوا تھا۔ رکا تو رکا رہا تھا..... خطرے کو سونگھتا رہا تھا..... خطرے کی بو کہیں سے آتی تھی حالانکہ وہ پنیر کی بو تھی ....پنیر کی بو تھی یا خطرے کی..... پہلی مرتبہ کسی احساس کسی ہوشیاری نے اس کے اندر جنم لیا تھا اور اس نے حرکت کی تھی..... آہنی فرش کو سونگھتا..... کبھی دبک کر..... کبھی اچھل کر..... کبھی جست بھرتے ہوئے..... کبھی بدحواسی ..... کبھی احتیاط تھی..... جو بھوک اور ڈر نے طاری کی تھی.....بھوک اسے بہکاتی تھی اور ڈر اسے دھمکاتا تھا..... ہوشیاری اور منصوبہ سازی تھی..... مگر کب آگاہ تھا کہ اس کی زندگی اس کے اوقات اس کی اپنی منصوبہ بندی اور ہوشیاری کے تابع نہیں تھے..... وہ اپنے اوپر جھکے سائنس دان کو دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا جس کے ہاتھوں میں اس کے اناج کی ڈوری تھی..... وہ بے خبر یونہی کسی جتن میں مصروف تھا..... ایک سمت کو چلتا رہا حتی کہ پہلی رکاوٹ نے اسے روکا..... وہ ڈر گیا..... ڈر کر دبک گیا..... پھر کچھ ساعت بعد حوصلہ پاکر پلٹا..... پھر رکاوٹ..... پھر حوصلہ پھر رکاوٹ..... پھر کئی پہر کا بھوکا جھنجلاہٹ میں آکر زگ زیگ رستوں پر بھٹکتا پھرا تھا..... منزل پر پہنچ جانے کی آس میں..... وہ باربار راستہ بھولتا رہا تھا..... رکاوٹوں سے ٹکراتا رہا تھا..... کبھی صحیح راستے پر آجاتا کبھی غلط پر نکل کھڑا ہوتا..... تو اس نے رزق تک پہنچنے میں گویا شام کردی تھی..... شام تو کردی تھی مگر صد اطمینان پھل بھی تو پایا تھا..........

یہ طمانیت کی بات تو تھی کہ وہ پہنچ گیا تھا..... مگر پہنچنے کے سوا چارہ کیا تھا..... بھوک کا کیا چارہ ہے..... اگرچہ ہشیاری نہیں بے خبری کام آئی تھی مگر یہ ایک بات تو سیکھی تھی کہ کچھ بھی کام میں لایا جاسکتا ہے چاہے وہ بے خبری ہی کیوں نہ ہو......

بے خبری سے خبر نہ پاسکنے والے چوہے بھی پنیر کی بو پاکر ضرور نکلتے رہے مگر بے خبر ہی

رہے اور ادھر ادھر بے کار منہ مارا..... کتر کتر کیا اور پلٹ گئے..... اور اس سے لا علم ہی رہے کہ ایک ان میں ایسا بھی تھا جو ممتاز ہونے کی تربیت میں تھا۔

تو..... روز بروز...... گھڑی بہ گھڑی..... تربیت پانے والے چوہے کے اندر حوصلے نے جگہ بنانا شروع کردی تھی..... وہ اپنے اوپر جھکے ہوئے جس آدمی کو دشمن سمجھتا تھا اس میں دوستی کی خو تھی۔ اب احتیاط لازم نہ تھی...... ڈر کی چادر دھوئیں کے غبار کی طرح اترتی گئی.... شفقت اور محبت کا سائباں پھیلتا گیا...... پنیر کی خوشبو ہر چیز پر غالب آتی گئی.....وہ سیکھتا گیا..... سیکھتا گیا..... کس سمت اسے چلنا تھا اور کس سمت اسے نہیں چلنا تھا..... اور آج وہ ہر رکاوٹ پر قادر تھا کہ رکاوٹ تو خوف اور بے خبری کا نام ہے۔

"چوہوں میں سیکھنے کی استعداد ہوتی ہے......" سائنس دان نے اپنی یاداشتوں میں یہ لکھا..... لکھا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ ایک تخلیقی مسرت اس کے سارے وجود پر بکھری ہوئی تھی۔ وہ ایک کام سے گزرا تھا..... تجربے کے آغاز سے آج تک وہ اس کی سیکھنے کی صلاحیتوں کو تجسس اور بے چینی سے دیکھتا آیا تھا..... وہ اس کے منزل مقصود پر پہنچنے کے وقت کو بھی نوٹ کرتا اور ان رکاوٹوں کو بھی جن کو وہ عبور کرنے کی کوششوں میں تھا..... تو یوں رفتہ رفتہ وقت بھی کم ہوتا گیا تھا اور رکاوٹیں بھی..... اور آج بالاخر آسودگی کا مرحلہ تھا......... مگر وہ کچھ ہی دیر آسودہ رہا تھا پھر اس کا چہرہ تفکر میں ڈوب گیا تھا اور پھر اس نے یہ بھی لکھا..... کہ "یہ سب کچھ ایک حد تک ہوتا ہے..... ایک چوہا ایک خاص حد تک سیکھنے کی صلاحیت کا اظہار کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تجربے کے لئے بے کار ہو جاتا ہے......"

چوہوں کو بے کار اکٹھا کرنے کے عمل میں سائنس دان مبتلا نہیں ہوتے..... وہ انہیں کام میں لاتے ہیں..... اس سائنس دان نے بھی یہی کیا تھا..... اور اب کسی دوسرے چوہے کا انتخاب کرنا تھا جو اس سے بھی کم وقت میں رکاوٹوں کو عبور کرتا اور اس کے علم میں اضافے کا باعث بنتا..... یہی سبب تھا کہ اس نے اپنے نتائج میں سیکھ جانے والے چوہے کو اب ناکارہ قرار دے دیا تھا۔

اجل اسے لے جاتی ہے جو سیکھتا ہے اور اجل اسے بھی لے جاتی ہے جو نہیں

سیکھتا..... یہ اور بات کہ کچھ تو اپنی موت مرجاتے ہیں اور کچھ چوہے کی موت مرتے ہیں ان پر کوئی دوسری مثال صادق نہیں آتی وہ بلوں میں چھپے ہوئے غلیظ چوہے ہوں یا صاف ستھرے پنجروں میں بند صاف ستھرے ممتاز چوہے ہوں.....

میز سے سیکھنے والے چوہے کی لاش اٹھاتے اور اسے کوڑا کرکٹ کے ڈرم میں پھینکتے ہوئے معلوم نہیں کیوں آج سائنس دان کو پہلی بار تاسف ہوا اور اس نے خیال کیا تھا کہ سیکھنے والے چوہے جو کچھ سیکھتے ہیں اپنے اوپر تجربہ کرنے والوں کے لئے سیکھتے ہیں اپنے لئے کچھ بھی نہیں۔ اوراس نے یہ بھی خیال کیاکہ چوہے کو معلوم نہیں تھاکہ اس کے ساتھ ایسا بھی ہوگا۔ اسے معلوم ہوتا تو شاید وہ آہستہ آہستہ سیکھتااور کبھی اپنے علم کو مکمل نہ ہونے دیتا..... ہلاکت تو ہر چوہے کا مقدر ہے مگر ہلاکت تک پہنچنے میں کچھ عرصہ تو صرف ہوتا..... اور اگر وہ یہ نہیں کرسکتا تھا تو دوسرے چوہوں کے ساتھ مل کر بغاوت کردیتا..... تاکم از کم غیرت میں آکر پنجرے کی دیواروں سے سر ٹکرا کر مرجاتا اس کے کسی کام نہ آتا.....

یہ باتیں ہر چند کہ اس کے سوچنے کی نہیں تھیں مگر اس وقت تک جب تک کہ وہ کسی دوسرے چوہے پر تجربہ کرنے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ ہوجاتا یوں ہی تفنن طبع کے لئے سوچتا رہا..... مگر اس نے جتنی بھی باتیں سوچیں وہ آدمیوں سے تو ممکن تھیں چوہوں سے نہیں اسی لئے وہ ہنس پڑا اور ہنستا رہااور یوں ہی ہنستے ہنستے خیال کیا..... کیا بعید ہے کبھی کوئی ایسا سائنس دان بھی آئے جو چوہوں کو آدمی بننا سکھا دے...... بات عقل و دانش کی نہیں تھی تمسخر کی تھی مگر ایک کام آنے والے چوہے کے احترام میں فضول سی خواہش کرنے اور امید رکھنے میں کیامضائقہ تھا۔

راوی کا بیان ہے کہ قدرت نے انہیں سوچنے والا دماغ تو عطا کردیا مگر ان کی جون میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کی..... وقت ان کے لیے انہونی لے کر آیا اور الجھن بن کر دل میں بیٹھ گیا..... کسی اور دن، کسی اور طرح رفع ہونے کے لیے۔

وہ بتاتا ہے کہ جنگل کی اس صبح میں کوئی اسرار نہیں تھا۔ دن معمول کے مطابق مشرق ہی سے نمودار ہوا۔ پرندے اڑنے پھرنے ہی سے آغاز ہوئے۔ شیر نے اپنے کچھار سے نکل کر شیروں کی طرح ہی دھاڑ لگائی..... بندر پیڑ در پیڑ بندروں کی طرح ہی پھلانگتے پھرے..... گدھ، چیلیں، کوے، طوطے، پیڑوں پر..... بھینسے، گھوڑے، ہرن، زرافے، میدانوں میں..... جانوروں کی طرح کہ جانور تھے۔ کل بھی اور آج بھی ....

..... تو کچھ بھی انوکھا نہ تھا..... سب کچھ ویسا ہی تھا کہ جیسا روز ہوتا تھا اور صدیوں سے تھا اور نسل در نسل چلا آتا تھا..... سوائے ان کے کہ جو بھیڑیوں کی جون میں تھے اور جنہیں اس دن، اس خاص دن غیب سے کچھ عجیب سا انکشاف ہوتا تھا۔

جنہیں عجیب سا انکشاف ہوتا تھا ان میں سے ایک وہ کہ جسے راوی بھیڑیا کہتا ہے روز کی طرح صبح سویرے کھلی فضا کو نکلا..... ٹہلتا پہلتا چلا..... ذرا بلندی پہ جاکر سورج کی شفاف کرنوں میں غسل کی خاطر رکا..... جھرجھری لی..... اور پھر تھوتھنی آسمان کی طرف بلند کرکے اپنی دانست میں ایک بھیانک آواز میں غرایا..... جیسا کہ بھیڑیئے غراتے ہیں اور پھر آخر وہ اس کے علاوہ کیا کرتا، یہی اس کے ہونے کے اعلان کا طریقہ تھا..... بھیڑیوں کی غراہٹ ہمیشہ سے عمل جنگ ہے ہر اس کے خلاف جو ان کے آگے بدحواسی میں بھاگنے اور بھاگتے بھاگتے کی صلاحیت رکھتا ہو..... وہ غرایا ایک فاتح کی طرح گردن اکڑائے ہوئے سر اٹھائے

ہوئے...... مگر اکڑی ہوئی گردن اور اٹھا ہوا سر اس وقت ٹھٹک کر رہ گئے جب اچانک معلوم ہوا کہ اس کی غراہٹ کی آواز ویسی نہیں ہے جیسی کہ اس کی جون کے مطابق ہونی چاہیے تھی...... یہ آواز اس کی تھی ہی نہیں کسی اور کی تھی...... تو یہ آواز کس کی تھی؟..... کیا میری تھی؟ ...... اس نے سوچا...... اور اس نے سوچا کہ کیا اس کے علاوہ وہاں کوئی اور بھی تھا؟ ..... وہ بہت چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا...... مگر وہاں کس نے ہونا تھا۔ جانور تھے..... سب اپنے اپنے کام میں جانوروں کی طرح....... وہ ایک مرتبہ پھر غرایا..... اور پھر بار بار غرایا...... محض شک دور کرنے کے لیے..... مگر وہی ایک اجنبی آواز..... تو شک کیسا؟ حقیقت تھی ..... اور حقیقت بھی ایسی کہ جس کا سامنا کرنے کی توقع بھیڑیوں کی پوری نسل نے کبھی نہ کی تھی۔

شکار اور شکاری ایک دوسرے سے اجنبی نہیں ہوتے۔ خبر رکھتے ہیں یا خبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں..... بو سونگھ لیتے ہیں۔ چاپ پا لیتے ہیں کہ بے خبری تو ناگہانی کا پیغام ہے..... شکاری جب جنگل میں کیمپ لگاتا ہے...... مچان باندھتا ہے...... تو سب کو نہ سہی مگر کچھ کو خبر ہوتی ہے..... اس نے بھی آدمیوں کو دیکھ رکھا تھا..... ہتھیار اٹھاتے' نشانہ باندھتے..... یا کسی پگڈنڈی پر ڈر کر بھاگتے....... تو یہ آواز آدمی کی تھی...... مگر اب سوال یہ تھا کہ آدمی کی آواز اس کے اندر کیسے سمائی...... ہو سکتا ہے یہ آواز ہمیشہ سے اس کے اندر ہو..... سنائی اب دی ہو......!

..... تو جب وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا تو اچانک ایک اور انکشاف بھی اس پر ہونا تھا۔ عجیب سا انکشاف...... کہ وہ تو سوچ بھی سکتا ہے...... خیال بھی کر سکتا ہے..... جان بھی سکتا ہے.....سوچنے سے جانوروں کا کیا کام ؟ ...... یہ اچانک کیا ہو گیا تھا...... اس انکشاف نے اسے کچھ اور بھی سنسنی سے بھر دیا اور وہ باؤلا سا ہو' گھوم گھوم کر خود کو دیکھنے لگا کہ کہیں وہ آدمی تو نہیں بن گیا...... مگر نہیں قدرت نے اسے بولنے کو زبان اور سوچنے کو دماغ تو عطا کر دیا تھا مگر اس کی جون مین کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی تھی..... وہ دیکھنے میں تاحال بھیڑیا ہی تھا..... مگر ایسا کہ جو آدمیوں کی طرح بولتا تھا اور آدمیوں کی طرح سوچتا تھا.....

تو یوں تھا کہ اس صبح اس انہونی پر وہ بہت دیر بھونچکا سا کھڑا رہا۔ اسے معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اس تبدیلی پر کس جذبے کا اظہار کرے...... ہنسے یا روئے...... دکھی ہو جائے یا سکھ کا سانس لے...... مگر وہ کسی جذبے کا اظہار کرتا بھی کیسے ..... ؟ سوچنے کو دماغ ملا تو یہ سوال دامن گیر ہوا کہ وہ درست طور پر ہے کیا؟..... آدمی ہے کہ بھیڑیا..... بھیڑیا ہے کہ آدمی؟

دن چڑھتا آیا تھا اور زوال اس کی منزل تھی سو وہ اور کتنی دیر حیران ہوتا۔ اب تو کوئی ایسا درکار تھا جو الجھن رفع کرتا...... حقیقت بتاتا..... پس جست لگائی اور پھلانگتا ہوا اس سمت کو ہو لیا جہاں اسی طرح کے اور بھی آباد تھے۔

.... تو جب وہ جست کرتا پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک وہ ہی نہیں' چاروں اور سے بے شمار بھیڑیئے اسی کی طرح پھلانگتے' ہانپتے کانپتے ایک ہی مقام پر یکجا ہو ہے تھے..... غالباً" سب کو ایک ہی فکر لاحق تھی...... مگر غالباً" کیا حقیقتاً"......؟ حقیقتاً سب سوچ میں ڈوبے تھے.... کھسر پھسر کرتے اور خاموش ہو جاتے ...... یہ آخر ہوا کیا تھا..... یہ کیسی صبح طلوع ہوئی تھی؟

بہت دیر فکر مند رہ کر بالاخر ان میں سے ایک نے جسے شاید زیادہ بہتر دماغ مل گیا تھا سب کو اپنی طرف مخاطب کیا اور بولا ..... "یارو..... پتہ تو کرو کہ یہ واردات صرف ہم پر گزری ہے...... یا سارا جنگل شہر میں بدل گیا ہے....."

ہاں یہ فکر بھی لازم تھی..... سو اس نے' جو زیادہ فکر مند تھا فوراً" ہی اس مشورے پر عمل کیا اور مڑ کر اپنے پیچھے پیڑ پر بیٹھے ایک پرندے کو موجود پاکر بڑے دھیمے مگر تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا....

"کیوں بھائی ..... کیا تم بھی بول لیتے ہو..... کیا تم بھی سوچ سکتے ہو....."

پرندے نے بھیڑیوں کے درمیان سے اجنبی سی آواز ابھرتی دیکھی تو قدرتی طور پر کچھ چوکنا ہوا۔ مگر پھر پرندوں کی طرح پر جھلائے کہ پرندہ تھا اور چہچہے کرتا شاخیں پھلانگتا کسی اور طرف نکل گیا۔ مخمصہ برقرار رہا.... مسئلہ حل نہ ہوا.... کسی اور سے پوچھنا چاہیے تھا۔

... تو کس سے پوچھنا چاہیے تھا؟..... اب انہوں نے گھاس کے میدان پر بھاگتے جاتے چوپایوں کے ایک غول کو تاکا..... یہ ہرن تھے۔ یا شاید گھوڑے تھے۔ گھوڑے تھے یا بھینسے

تھے؟ ...... راوی کہتا ہے کہ کچھ فرض کرلو..... خیر جو بھی تھے چوپائے تھے..... چوپایوں نے جب اتنے بے شمار بھیڑیوں کی چاپ پائی تو بدک کر اور بھی تیزی رفتاری سے بھاگنے لگے۔ مگر سب کی رفتار ایک سی کب ہوتی ہے کچھ کی تقدیر میں پیچھے رہ جانا ہوتا ہے۔

جو پیچھے رہ گیا وہ بالکل نڈھال ہوگیا۔ اسے بھیڑیوں نے آلیا..... گھیر لیا..... گرالیا..... اس ضعیف کم نصیب نے اپنی حیات کے لیے بہت دیر مزاحمت کی مگر تقدیر کے لکھے کو تسلیم کیااور آنکھیں موند لیں..... لیکن اس بے علم کو کیا معلوم تھاکہ ان کا اصل منشاء کیا تھا جو بھیڑیوں کی جون میں تھے..... جب اس کی مزاحمت ختم ہوئی تب انہوں نے اسے اپنی گرفت سے آزاد کیا اور دائرہ در دائرہ اسکے گرد اکٹھے ہو گئے ایک نے کہا کہ "ڈرو نہیں ہمارا مقصد تمہیں گزند پہنچانا نہیں۔ ہم مہذب بھیڑیے ہیں۔ نہیں آدمی ہیں ..... نہیں بھیڑیے ہیں..." وہ کچھ دیر کے لیے متذبذب ہوا مگر پھر جھلا کر گفتگو جاری رکھی۔ "خیر جو بھی ہیں ..... فی الوقت یہ جاننا مقصود ہے...... کیا تم بھی بول سکتے ہو...... کیا تم بھی سوچ سکتے ہو.....؟"

وہ چوپایہ جو بھیڑیوں میں گھرا کھڑا تھا..... ان اجنبی آوازوں پر ٹس سے مس نہ ہوا..... اس بے چارے کو کیا معلوم کہ کون کیا کہہ رہا تھا؟... "ڈرو نہیں ..... بولو......" مگر وہ کیا بولتا کہ وہ توناحال جانور تھا..... اسے کیا خبرکہ کون کیاپوچھ رہا تھا..... جانور سوچتے کب ہیں...... وہ تو محض محسوس کرتے ہیں..... وہ چوپایہ انسانی آوازوں پر صرف کچھ عجیب سامحسوس کر رہا تھا..... بھیڑیے دیر تک اس سے استفسار کرتے رہے مگر وہی ایک خاموشی...... اور پھر ایک مانوس سی حیوانی خرخراہٹ...... وہ سرجھکا کر ہٹ آئے..... اب کوئی شک باقی نہیں تھا..... آسمان پر پرندے اپنی اپنی آوازوں میں بول رہے تھے..... اورجانوروں کے شور سے جنگل گونج رہاتھا..... وہی اپنی اپنی بولیاں..... لفظوں سے عاری اپنی اپنی بولیاں..... جیسا کل تھا ویسا آج تھا....... وہ واپس چل دیے۔ واپسی کی سفر پر ان میں سے کسی ایک نے نہایت مردہ دلی سے کہا۔ "افسوس اب ہم بھیڑیے نہیں رہے آدمی ہو گئے ہیں...."

"..... مگر ہم آدمی بھی کب ہیں؟" کسی دوسرے نے کسی اور ہی تشویش کا ظہار کیا.....

"تو ہم درست طور پر ہیں کیا..... آدمی ہیں کہ بھیڑیئے۔ بھیڑیئے ہیں کہ آدمی؟" یہ کوئی تیسرا تھا۔

اس کائنات میں ہر دوسرا' تیسرا یہ ضرور سوچتا ہے کہ ہم درست طور پر ہیں کیا.... انہوں نے البتہ یہ پہلی مرتبہ سوچا..... مگر پہلی ہی مرتبہ تو انہیں سوچنے والا دماغ ملا تھا...اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ سوچنے والا دماغ تو ملا مگر ان کی جون میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی...... سو ان کا سوچنا' سوال کرنا' کائنات کی ہر چیز سے زیادہ بجا ہوگیا۔

تو یونہی سوچتے خیال کرتے صبح سے شام ہوگئی...... نہ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا..... کھاتے پیتے کیسے پہلے تشویش تو رفع ہوتی...... مگر شام اپنے ساتھ نقاہت لے کر آئی۔ اب کھانے پینے کی فکر لازم تھی۔ لیکن رات ہونے کو آئی تھی..... پرند' چرند سب اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے تھے۔ تاریکی نے سب پر چادر ڈال دی تھی۔ حفاظت کا بندوبست کردیا تھا۔ اب شکار کا حصول قدرے مشکل تھا۔

جنگل کا بھی اپنا ایک انتظام ہے۔ طاقتور اور وحشی درندوں کو یہ سہولت حاصل نہیں ہے کہ شکار خود سر جھکاکر ان کے روبرو حاضر ہوجائے ..... گھات لگانا پڑتی ہے۔ تعاقب کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں کوشش اور جدوجہد سے کچھ ہاتھ آتا ہے.... تو یہ صورت تھی کہ رات آگئی تھی..... اور رات جب جنگل کو تاریک کرتی ہے تو کمزور ترین جانوروں کے ٹھکانے بھی قلعے کا حصار ثابت ہوتے ہیں۔ سو بھیڑیوں نے دیر کردی تھی یہی سوچتے خیال کرتے کہ وہ آدمی ہیں یا بھیڑیئے... اب کیا ممکن تھا؟

ممکن تھا کہ یہ شب خالی پیٹ ہی گزر جاتی۔ مگر جب بھوک نے نڈھال کیا تو وہ ہر سوال بھول گئے... یا پھر یہ کہ اپنے سوال کا جواب پالیا.... آدمی تھے یا بھیڑیئے تھے' اس سے کیا فرق پڑتا تھا...... بھوک تو بذات خود ایک درندہ ہے... وہ آدمی کی ہو یا بھیڑیئے کی ہو.....

بھیڑیوں کی ایک ٹولی جب شکار کی غرض سے اٹھی تو ایک نے تشویش سے کہا شکار؟... اور اس وقت؟...... اس وقت تو سب قلعہ بند ہوکے روپوش ہوتے ہیں.... یہ سن کر وہ بھیڑیئے ہنسے جو شکار کی غرض سے اٹھے تھے اور پھر بیک زبان کہا "ہرچند کہ رات ہے مگر جو

دماغ رکھتے ہیں ان پر سب ظاہر ہوتا ہے..... جنگل میں اب وقت صرف ہمارا ہے ...."

جاننا چاہیے کہ جنگل میں وقت کسی ایک کا نہیں ہوتا۔ سب کا ہوتا ہے.... بھیڑیے کا بھی اور بھیڑ بکری کا بھی.... ایک کمزور سی بھیڑ کو بھی اپنی حفاظت درپیش ہو تو وہ بعض اوقات تنومند شیر کے سامنے تن جانے سے بھی گریز نہیں کرتی..... جنگل صرف اس کا نہیں جو پلٹ کر جھپٹنا جانتا ہو اس کا بھی ہے جو بھاگ لینے اور روپوش ہوجانے کے گر سمجھتا ہو..... جسے دشمن کو تھکادینے کی صلاحیت حاصل ہو.... ہر جنگل میں کچھ درندے بھی ہوتے ہیں ضرور ہوتے ہیں۔ مگر اس میں عجیب کیا ہے ..... درندوں کے کئے سے جنگل اجاڑ کب ہوئے ہیں.... دیکھنے والوں نے تو بھیڑیوں کو بھی بھیڑوں اور بکریوں کی طرح جان بچانے کی فکر میں بھاگتے دیکھا ہے...

..... مگر راوی کہتا ہے کہ اب اور بات ہوگئی تھی۔ وہ جو بھیڑیوں کی جون میں تھے انہیں قدرت نے کچھ عجیب سا عطا کردیا تھا..... اور انہوں نے یہ جانا تھا کہ عقل حاصل ہونے سے اور کچھ نہیں ہوتا..... نہ اندر کوئی تبدیلی آتی ہے نہ باہر کچھ بدلتا ہے صرف طاقت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ چیزیں اختیار میں آجاتی ہیں..... شکار کی کامل حکمرانی حاصل ہوجاتی ہے... اور کچھ مشکل نہیں رہتا۔ بھیڑیوں کو اس لیے عقل درکار ہے تاکہ غراکے... چھپ کے، گھات لگاکر..... اور تعاقب میں بھاگ کر، جدوجہد کرکے شکار کرنے کی دقت درپیش نہ ہو..... منصوبہ بندی اور بہتر حکمت عملی کے نت نئے گر ہر منزل کو آسان کردیں۔ سارا جنگل شکار ہونے کے لیے خود حاضر ہوجائے۔

وہ رات بیت گئی جس کی صبح میں اسرار تھا۔ پھر اگلا دن.... پھر اگلی رات .... پھر دن، پھر رات..... پھر کئی راتیں گزر گئیں۔ شکار کرنے میں انسانی عقل نے جو سہولت انہیں فراہم کی تھی، اس نے انہیں وہ سوال فراموش کرادیا، یا اور طرح سے حل کردیا جو پہلے روز انہیں درپیش ہوا تھا.... اب تو ایک نیا کھیل تھا اور نئے گر تھے.... کہیں کوئی مشکل نہ تھی......... سب آسان تھا۔

سب آسان ہوا تو شکار کی فراوانی ہوگئی۔ شکار کی فراوانی خوشحالی لے کر آئی اور خوشحالی

سے بھیڑیوں میں بھائی چارہ فروغ پا گیا.... وہ یکجا ہو گئے۔

اب وہ رات کو چوپال لگا کر بیٹھتے تو اپنے ماضی پر بہت حیران ہوتے۔ خاص طور پر اپنے شکار کے روایتی طریقوں پر بہت ہنسی آتی اور افسوس کرتے کہ "ہم بھی کتنے نادان تھے۔ ہم میں سے ایک شکار کرتا تو دوسرے اس میں اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے کس طرح جھپٹ پڑتے تھے.... اور کتوں کی طرح آپس میں لڑتے تھے.... بھیڑیا بھیڑیے کا دشمن ہو جاتا تھا.... کتنے غیر مہذب تھے ہم............"

بھیڑیوں کے لیے غیر مہذب ہونا ہی مناسب ہوتا ہے تاکہ وہ الگ سے شناخت کیے جا سکیں مگر بولنے اور دماغ رکھنے والے بھیڑیوں کے لیے خوشحالی ہی ان کی تہذیب تھی........ بے فکری کو فروغ حاصل ہوا کہ برفانی موسم بھی اب مشکل نہیں رہے تھے۔ ان کے پیٹ اور ان کے ٹھکانے شکار کیے ہوئے جانوروں سے بھرے رہتے.... مگر کیا یہ کافی تھا........؟

عقل کو آسمانوں پر پرواز کرنے اور پاتال میں اترنے کا عجیب چسکا ہے۔ تلاش کرنے اور پالینے کی جستجو انہیں کب دم لینے دیتی ہے جو دماغ رکھتے ہیں........ تو شکار ایک کھیل تھا.... تلاش کرنے اور پالینے کا......... سب ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی تگ و دو میں لگ گئے........ اور بھیڑ بکریاں کم ہوتی گئیں..... بھیڑوں پر ہی کیا موقوف ہر جانور گمشدہ سامان بن گیا.... اور جنگل سکڑنے لگے..........

راوی کو افسوس ہے کہ وہ کم نصیب نہیں جانتے تھے کہ ہر کھیل کا ایک متعین وقت ہوتا ہے پھر اس کو ختم ہونا ہوتا ہے.... ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ تمام گڑھے اور رکاوٹیں اور دانہ و دام جو جانوروں کو پھانسنے اور شکار کرنے کے لیے انسانی عقل کے بل بوتے پر جگہ جگہ بچھائے گئے تھے، ان میں سے کوئی کوئی اکثر خالی رہنے لگا.... مگر چونکہ خوشحالی کے باعث ایک تو زندگی سہل سی تھی دوسرا ہر کھوہ، ہر کچھار میں ذخیرہ کیے ہوئے شکار کی بہتات تھی........ لہٰذا فکر مندی کا ابھی کوئی مقام نہ تھا..... مگر کتنی دیر؟

..... پھر وہ گھڑی بھی آ گئی جب وہی صبح کہ جس میں اسرار تھا، گھومتی گردش کرتی ان کے درمیان لوٹ آئی.... اور سوال بن گئی..... خندقیں، دام، کھوہ اور کچھار.... سب شکار کو

ترسنے لگے ..... وہ اپنی طاقت اور عقل کو لئے لئے پھرتے رہے مگر سارا جنگل خالی تھا اور آگے سامنے برفانی موسم دستکیں دینے کو بڑھا آتا تھا.... کیااب بھی یہ فکر مندی کی بات نہ تھی...؟

فکر مندی کی بات تو تھی کہ آخر وہ سب جانور کیا ہوئے جو صرف جانور تھے.... کیا ان کا وجود جنگل سے ناپید ہوا........ یا وہ کسی اور جگہ روپوش ہوئے..... یا پھر کہیں آدمی کی جون تو اختیار نہیں کرگئے........ اور یہ جو بستی بستی شہر شہر لوگ گھومتے پھرتے ہیں کہیں وہ تو نہیں.......... اگر وہی ہیں تو نہایت برا ہوا......

عقل رکھنے والے جلدی فکرمند ہوتے ہیں........ اگر طاقت بھی ہمراہ رکھتے ہوں تو طاقت کے کم ہو جانے کا اندیشہ وحشت میں بھی مبتلا کرتا ہے رنجیدہ بھی کر دیتا ہے' جنگل اجڑ گئے تھے اور بھوک کا سامنا کرنے کی تاب نہیں تھی..... جبکہ بھیڑیئے گھاس پھوس کھانے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے۔

"وہی دن اچھے تھے جب ہم بھیڑیئے تھے صرف بھیڑیئے..... اور بکریاں صرف بھیڑ بکریاں۔"

غمزدہ بھیڑیئے اب جب کبھی رات آتی تو انسانی بستیوں کا رخ کر جاتے اور چھپ چھپ کر ان کا نظارہ کرتے جو مکمل طور پر آدمی کی جون تھے' تب ان کا منہ ایک نئی لذت اور نئے ذائقے سے بھر جاتا۔ آدمی کو شکار کرنا چاہیے..........

آدمی کو شکار کرنا چاہیے مگر کیسے؟ کوئی بھولا بھٹکا کبھی کبھار قسمت سے ہاتھ آجاتا تھا مگر ایسا تو ہمیشہ سے تھا......... اب تو چاروں اور شکار کی حکمرانی درکار تھی۔ کوئی بستی درکار تھی۔ گھر کے گھر.......... شہر کے شہر...... اور ہمیشہ .... مگر ایسا کب ممکن تھا.......؟ وہ جانتے تھے کہ جانوروں کو شکار کرنے کو تو عقل اور طاقت ہی کافی ہے جبکہ آدمی کو اپنے اختیار میں لینے کے لیے کچھ اور بھی درکار تھا......... آدمیوں کے درمیان بھیڑیوں کی جون میں جانا کیسے ممکن تھا؟ تب وہ حسرت کی آہ بھرتے اور گلہ مند ہو جاتے......... اے کاش آدمیوں کی طرح سوچنے والا دماغ اور بولنے والی زبان عطا ہوئے تھے تو کیا مضائقہ تھا کہ وہ بھیڑیئے کی جون نہ ہوتے آدمی کی جون ہوتے.... تب کتنا آسان

ہوتا.........

راوی کہتا ہے پھر کئی دن اور کئی راتیں گزر گئیں۔ نقاہت اور بے چارگی نے ان کی نسل کو ضعف پہنچایا ..... اور امکان تھا کہ وہ کسی بھی وقت صفحہ ہستی سے ناپید ہو جاتے، کہ ایک اور انکشاف بھی ان پر ہوا.......... جیساکہ اس سے قبل ان پر ہوا تھا.... بس اچانک....

اچانک ایک صبح جب وہ بیدار ہوئے تو اب آدمی کی جون تھے.... مکمل طور پر آدمی کی جون.......... جیسے شہروں میں جیسے بستیوں میں..... انہیں وہ سب کچھ عطا ہو گیا تھا جس کی وہ تمنا رکھتے تھے۔ انہیں ہاتھ عطا ہو گئے تھے کام کرنے کے لیے اور پاؤں چلنے پھرنے اور بھاگنے دوڑنے کے لیے..... اور اب ان پر بھیڑیا ہونے کا کوئی گمان نہیں تھا..... کیا یہ خوشی کی بات نہ تھی.........؟

کیا یہ خوشی کی بات نہ تھی کہ جنگل نے ان پر سارے راستے کھول دیئے تھے اور بستیاں اور شہر، گلیاں اور گھر اب ان کے استقبال کو بھی حاضر تھے۔

....تو بھیڑیئے جو دیکھنے میں آدمی تھے انہیں اب کسی رکاوٹ کا سامنا نہ تھا... وہ اپنا جنگل چھوڑ ہنستے مسکراتے رقص کرتے گیت گاتے بستیوں میں پہنچے..... اور سب کو حیران کیا' ...."تم کون لوگ ہو؟ اور کون سے وطن سے آئے ہو؟".... اجنبیوں سے پہلا یہی سوال ہوتا تھے۔ ان سے بھی یہی پوچھا گیا۔

"ہم بھیڑیئے ہیں.........." پہلا جواب یہی تھا جو عجلت میں دیا گیا۔

"نہیں نہیں ہم آدمی ہیں.........." کسی دوسرے نے عجلت سے اصلاح کی۔

وہ آدمیوں کی طرح بولتے تھے آدمیوں کی طرح سوچتے تھے اور آدمیوں کی جون میں تھے، پھر بھلا ان کے اپنے کہنے سے کوئی انہیں بھیڑیا کیوں سمجھتا..... تو ایسا ہے کہ وہاں ان کے رہنے بسنے پر کسی کو کچھ اعتراض نہ تھا۔ کہ آدمیوں کے درمیان ہی آدمی رہتے بستے ہیں.... مگر حیف وہ وہاں محض آدمیوں کی طرح رہنے بسنے تو نہیں آئے تھے.... انہیں تو ایک نئی لذت، نیا ذائقہ وہاں لایا تھا........ مگر سوال یہ تھا کہ آدمی آدمی پر کیسے جھپٹے کہ اب سب

آدمی تھے............ وہ بھی اور یہ بھی..........

یاؤش بخیر جب بھیڑیوں نے اپنی تہذیب کو ارتقا دیا تھا تو یہ یاد کرکے بہت ہنسا کرتے تھے کہ گئے زمانوں میں وہ کس قدر جاہل تھے' جو کتوں کی طرح آپس میں لڑا کرتے تھے اور بھیڑیا بھیڑیے کا دشمن تھا اب وہی سیکھا ہوا سبق ان کے راستے کی دیوار تھا..... کہ سب آدمی تھے........ وہ بھی اور یہ بھی........

راوی کہتا ہے جب کسی پر کوئی مشکل آتی ہے اور رکاوٹ بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور پرانے سارے حربے ناکام ہو جاتے ہیں تب نئی فکر پیدا ہوتی ہے..... ہر ایک کی اپنی اپنی فکر ہوتی ہے..... آدمیوں کی اور... بھیڑ بکریوں کی اور... تو اس دن جس روز انہیں اپنا جنگل بہت یاد آیا اور ایک بھیڑیے نے یہ کہا "اے کاش کہ ہم بھیڑیے ہی ہوتے....... یا کبھی کبھی بھیڑیے کی جون میں واپس جا سکتے۔" تو وہ دن ان کی مشکل کا آخری دن تھا........ پھر ان میں سے ایک پر نئی فکر آشکار ہوئی... اور اس نے کہا "بے شک جانور سے آدمی بننا ممکن نہیں... اس کے لیے کوئی معجزہ ہی درکار ہے.... جیسا کہ ہمارے ساتھ ہوا....... مگر آدمی سے جانور بننے میں کوئی مشکل نہیں... یہی تو کرنا ہوتا ہے کہ جب چاہو..... آدمیوں کی طرح سوچنا چھوڑو.... گھات لگاؤ اور جھپٹ پڑو۔"

راوی کا بیان ہے کہ اس دن کے بعد سے تاحال بھیڑیے آدمیوں کے درمیان ہنسی خوشی رہتے ہیں...... اور اب انہیں کوئی مخمصہ درپیش نہیں.... وہ آدمیوں کی طرح سوچتے ہیں' آدمیوں کی طرح بولتے ہیں اور آدمیوں کی جون ہیں.... ماسوا اس کے کہ جب کسی نحیف کم نصیب کو بھیڑ بکری کی طرح بے خبر پاتے ہیں بھیڑیے کی طرح غراتے ہیں اور جھپٹ پڑتے ہیں.... جنگل انہیں فراموش ہوا ہے کہ اب یہی ان کا جنگل ہے .... یہی شہر یہی گلیاں' یہی گھر.... اس وقت تک کہ جب تک کہ وہ کسی اور نئی جون میں نہیں چلے جاتے......

بھیڑ بکری

یہ ایک ایسے کتے کی کہانی ہے جو بھیڑ بکریوں پر حکمرانی کرتا تھا مگر ناگہانی ان کی بھگدڑ کا شکار ہوا۔ اور ان کے قدموں تلے آکر کچلا گیا۔

آغاز میں اس کے سپرد کوئی کام نہیں تھا۔ چرواہے کے ساتھ اس کی موجودگی ہی بذات خود ایک کام تھا۔ اصل ذمہ داری چرواہے کی تھی جو پشت در پشت، نسل در نسل بھیڑ بکری چراتا آیا تھا۔

چرواہے نے کتے کو اپنے پیشے کے حوالے سے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی تھی حالانکہ اس کی موجودگی سے بھیڑ بکریوں میں ایک انجانا سا خوف جاگزیں رہتا تھا اور اس طرح وہ ایک تنظیم میں رہتی تھیں مگر چرواہا اسے ایک حد ہی میں رکھتا۔ اسے ریوڑ میں گھسنے، کسی بھیڑ بکری کے تعاقب میں بھاگنے یا کسی پر بلاوجہ بھونکنے کی اجازت نہیں تھی۔ جب وہ ایسا کرتا تو اسے ڈانٹ کا سامنا کرنا پڑتا۔ یا روڑہ کنکر مارے جانے کی سزا بھی مل جاتی۔

کتے کے معمولات بس اتنے تھے۔ رات چرواہے کے قدموں کے ساتھ جڑ کر سولینا صبح اس کے پیچھے پیچھے سبزہ زار کی طرف چل پڑنا۔ دن بھر دھوپ میں پڑے اونگھنا اور شام کو اپنے مالک کے ہمراہ ٹہلتے ٹہلتے لوٹ آنا۔ ہاں کبھی کبھار۔ جب کوئی بڑا جانور ریوڑ میں گھس آتا یا کوئی بھیڑ بکری اپنے گروہ سے الگ ہوتی دکھائی دیتی تو تب اسے اپنی کچھ کارگزاری دکھانے کا موقع ضرور مل جاتا۔ وہ وفاداری نبھانے کے لئے خوب زور شور سے بھونکتا اور داد پاتا۔ باقی سب ذمہ داری چرواہے کی تھی۔

صبح ابھی ملگجا سا اندھیرا ہوتا کہ بستی کے لوگ اپنی اپنی بھیڑ بکریاں چرواہے کے باڑے میں چھوڑنے آنے لگتے۔ جب پہلی بھیڑ یا بکری ممیاتی تو کتے کے کان کھڑے ہوتے وہ چوکنا

ہو کر سر اٹھاتا، ہولے ہولے بھونکتا، پھر کھڑا ہو کر دم ہلاتا اور پھر اپنے مالک کے تلوے چاٹنے لگتا۔ یہ گویا کام پر جانے کا اعلان تھا۔ پھر دونوں اٹھتے اور ریوڑ کو لے کر کسی سبزہ زار کی طرف چل پڑتے۔

اس بستی میں بھیڑ بکریوں کے علاوہ آدمی بھی رہتے تھے مگر چرواہے نے آدمیوں پر کبھی غور نہیں کیا تھا۔ اس کے خیال کرنے کو بھیڑ بکریاں ہی کافی تھیں۔ ان کے درمیان رہتے رہتے وہ خود کو ان ہی میں سے کوئی ایک سمجھتا تھا سوائے اس کے کہ اسے ان پر حکمرانی حاصل تھی۔

یہ حکمرانی بڑا کٹھن کام تھا۔ ہر ایک کو دھیان میں رکھنا نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دینا۔ ان کے زخمی ہونے کھو جانے یا کسی حادثے کا شکار ہو جانے کا دھڑکا اسے ان کے لئے ہمیشہ متفکر رکھتا تھا۔ دن ان کے بکھیڑوں میں گزارتا تو رات بھی ان کے خیال میں بسر ہوتی۔ خواب دیکھتا تو خواب میں بھی بھیڑ بکریاں ہی ممیاتیں۔

اسے آدمیوں کے چہرے یاد نہیں رہتے تھے لیکن بھیڑ بکریوں کو خوب پہچانتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سا جانور کس گھر سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بتا سکتا تھا کہ یہ جو بھیڑ ابھی ابھی ممیائی ہے وہ کس کی ہے۔ اس کا رنگ کیسا ہے۔ اس کی جسامت کیا ہے۔ یعنی وہ کون ہے؟

بھیڑ بکریاں بھی اسے خوب سمجھتی تھیں۔ اس کے تیور پہچانتی تھیں۔ ذرا دور نکل جاتیں تو اس کی ایک آواز پر لوٹ آتیں۔ یا پھر وہ ان کی طرف کنکر پتھر پھینکتا تو وہ سنبھل جاتیں۔ کوئی کوئی کبھی کبھی مچلتا ضرور تھا مگر بالآخر قابو میں ہی رہتا تھا۔

تو بھیڑ بکریوں پر ہمیشہ سے چرواہے کی حکمرانی تھی کتے کی نہیں۔ مگر پھر ایسا وقت بھی آیا کہ وہ حکمرانی کتے کو منتقل ہوئی۔ آہ چرواہے کا بیچارہ کتا۔

جاڑے کی ایک رات جب چرواہے کو اچانک بخار نے آگھیرا تو اس صبح اس کے لئے اٹھنا دشوار ہو گیا۔ صبح ہو گئی مگر غشی نے پوری طرح بیدار نہ ہونے دیا۔ وہ آنکھیں کھولتا اور بند کر دیتا اور سوچتا کیا وہ آج کے دن اپنے کام پہ نہیں جا سکے گا۔ بچپن سے اب تک اس

نے زندگی کا یہی معمول دیکھا تھا۔ یہی زندگی تھی۔ تو کیا آج کا دن زندگی میں شامل نہیں ہو گا۔ وہ بے چین رہا۔ مگر اس سے زیادہ بے چین اس کا کتا تھا۔ اس نے بھی یہی معمول دیکھا تھا۔ مگر وہ تو حالت بخار میں نہیں تھا۔ اپنے وقت پر چونک کر اٹھ گیا۔ اور اجالا ہونے پر اس کے گرد گھومنے کرلانے اور دم ہلانے لگا۔ مگر چرواہے کے جوڑ جوڑ میں درد تھا وہ کیسے اٹھتا۔ کتے نے بہت دیر دم ہلائی۔ اسے چوما چاٹا۔ باڑے میں بھیڑ بکریاں اکھٹی ہو چکی تھیں اور بے چین ہو ہو کر بولے جا رہی تھیں۔ دن روشن ہو رہا تھا۔ ہر چیز معمول کے مطابق آگے بڑھ رہی تھی۔ اتنی تاخیر اس سے قبل تو کبھی ہوئی نہ تھی۔ اس لئے جب بھوک نے بے چین کیا تو پھر اور کیا حل تھا۔ باڑے کے اندر بھیڑ بکریاں پہلے تو ایک دوسرے کے قریب ہوئیں پھر ایک دوسرے کو دھکیلا۔ بیک وقت ممیائیں۔ پھر باڑے کے کمزور سے جنگلے کو پھلانگتی باہر نکلیں اور چل پڑیں۔ ان کے قدم راستے کو پہچانتے تھے چلتی رہیں۔

کتے نے انہیں یوں بے مہار منہ اٹھائے جاتے دیکھا تو گھبرا گیا۔ پہلے وہ چرواہے کے سرہانے آکر بھونکا مگر وہاں تو غشی تھی۔ اب کیا کرتا پھلانگ کر باہر نکلا اور جست کر کے ان کے درمیان گھس گیا۔ وہ بدک کر بکھر گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا مقصد انہیں منتشر کرنا نہیں تھا۔ یہ احساس دلانا تھا کہ وہ از خود کسی طرف کو رخ کرنے کی مجاز نہیں ہیں۔ مگر وہ تو بکھر گئی تھیں۔ اب کیا کرتا۔ ؟

ایک کتا کیا کر سکتا ہے۔ ؟ بھونک سکتا ہے اور کاٹ سکتا ہے۔ اس نے چرواہے کو انہیں ایک ریوڑ میں رکھ کر ہانکتے دیکھا تھا۔ لیکن اب چرواہا تو تھا نہیں۔۔ بھونکنا اس کا کام تھا۔ پہلے ایک جگہ تن کر کھڑا ہوا اور بھونکا۔ پھر ادھر ادھر بکھری ہوئی بھیڑ بکریوں کے گرد گھوم پھر کر بھونکا۔۔ ایک ایک کی ٹانگوں میں گھس کر کے بھونکا.................. سامنے آیا۔ پیچھے ہٹا۔ پھر دائیں۔ پھر بائیں۔ وہ بدکیں۔ وہ بھاگیں ۔ خوف زدہ ہوئیں ایک دوسرے کے قریب آئیں اور ایک دوسرے کو دھکیلتی جڑ کر چلنے لگیں۔ حتیٰ کہ لہلہاتا ہوا سبزہ زار آگیا۔ یہیں پہنچنا سب کا معمول تھا۔ یہیں سب بے خبری میں پہنچ گئے۔ سوائے اس کے کہ چرواہا آج ہمراہ نہیں تھا۔

کتا بھیڑ بکریوں کو چراہ گاہ جانے سے نہیں روک سکا تھا مگر وہ کم از کم انہیں ایک ریوڑ کی شکل دینے میں ضرور کامیاب ہوا تھا۔ اگر وہ نہ بھونکتا' اگر وہ انہیں کاٹنے کو نہ دوڑتا اور اگر وہ انہیں خوف زدہ نہ کرتا تو وہ ایک دوسرے کی ٹانگوں میں گھس کر پناہ حاصل کرنے کی کوششوں میں کبھی بھی جڑ کر نہ بھاگتیں۔ شاید کہیں ادھر ادھر بکھر کر ہی منہ مارتی رہتیں۔ تو یہ اطمینان کی بات تھی کہ وہ سب ادھر ادھر ہوئے بغیر ہی چراہ گاہ تک پہنچ گئی تھیں حالانکہ کتا اب بھی بھونک رہا تھا اس کی ناراضگی برقرار تھی کہ چرواہے کے بغیر یہ سارا عمل کیسے ہوا؟ --- کیوں ہوا ؟

چرواہا جھونپڑے میں اپنی کھاٹ پہ پڑا کراہ رہا تھا۔ پھر دن چڑھے کسی وقت اس کی آنکھ کھلی۔ ذرا سے حواس بحال ہوئے تو اس نے محسوس کیا کہ معمول میں کوئی بگاڑ پیدا ہوا ہے چاروں طرف خاموشی تھی۔ ممیانے کی آوازیں نہیں تھیں اور نہ ہی کتے کی کراہٹ تھی۔ ناچار اٹھا۔ باڑے کا کمزور سا جنگلا ٹوٹا گرا تھا۔ دل دھک سے رہ گیا۔ گرتا پڑتا چلا۔ گلیوں میں روز کا معمول آغاز تھا۔ بچے کھیلتے پھرتے تھے۔ عورتیں کام کاج میں تھیں۔ بوڑھوں کا کھانسنا کنگھارنا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ ادھر ادھر جھانکتا تلاش کرتا بستی سے باہر سبزہ زار کی طرف چلا کہ ممکن تھا سب وہیں پائے جاتے۔ بمشکل پہنچا اور حیرت و اطمینان کے ساتھ گھاس پر ڈھیر ہو گیا کہ سب وہیں تھے۔ بھیڑ بکریاں بھی اور کتا بھی۔

.... تو چرواہے کا بے کار سا مسکین و عاجز کتا آج بہت کارگر ثابت ہوا تھا............

مختصر یہ کہ یوں کتے کی اہمیت کا عہد شروع ہوا۔ چرواہے کا بخار تو خیر پہلے ہی زور جاتا رہا مگر نقاہت سی ہو گئی جو چند دن برقرار رہی..... پھر چونکہ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ باڑے سے چراہ گاہ تک کے سفر میں ریوڑ کو پہنچنے میں کتے کی رہنمائی میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس لئے کچھ بے پرواہی سی بھی اس کے مزاج میں شامل ہو گئی - اب اس کے صبح اٹھنے اور زیادہ مستعدی دکھانے میں وہ پہلی سی طراری نہیں رہی تھی...... وہ کتے پر اعتماد کر سکتا تھا......

وہ کتے پر اعتماد کر سکتا تھا....... اسی لئے اب معمولات بدل گئے تھے-- اب جب صبح

ہوتی تو وہ کتے کو پہلے ہی سے مستعد پاتا جو اس کے ایک ہی اشارے پر جست کر کے باہر نکلتا اور باڑے میں گھس جاتا۔ اس کے ہانپنے اور بھاگتے آنے کا سن کر بھیڑ بکریوں میں خوف گھر کرتا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتیں۔ جڑ کر ایک دوسرے کو دھکیلتیں۔ باڑے سے باہر نکلتیں اور ناک کی سیدھ میں چراہ گاہ کو چل پڑتیں۔ چرواہا ذرا بعد میں آتا۔

چرواہا غرور سے سر اٹھائے اپنا لمبا مضبوط ڈنڈا گردن کے پیچھے جمائے اور اسمیں بازو لٹکائے ٹہلتا ٹہلتا بعد میں آتا..... اس وقت جب اسے دور کسی پگڈنڈی پر دھول کے بادل میں لپٹا ہوا ریوڑ بڑی تنظیم کے ساتھ چراہ گاہ کی طرف جاتا دکھائی دیتا..... کتا ان کے ہمراہ یوں چل رہا ہوتا جیسے کوئی سپہ سالار اپنی تربیت یافتہ فوج کے ساتھ تن کر چلتا ہے.... کبھی دائیں .... کبھی بائیں .... کبھی آگے کبھی پیچھے .... سب طمانیت کا سامان تھا ..... چرواہے کو یہ سہولت راس آئی......

چرواہے کو ریوڑ لے کر چراہ گاہ پہنچنے میں کچھ وقت لگا کرتا تھا مگر کتا یہی کام پلک جھپکنے میں کرنے لگا.... چرواہے کو بعض اوقات ایک ایک کو الگ الگ بھی ہانکنا پڑتا تھا.... سبزہ زار کی طرف جاتے بعضے جانور ایسے بھی ہوتے جو راستے پر ہی گھاس کا کوئی چھوٹا سا قطعہ دیکھ کر مچل جاتے اور وہیں منہ مارنے کو رک جاتے اس کے لیئے ان ناسمجھوں کو گھاس سے الگ کرنا اور چراہ گاہ کی طرف لے چلنا کچھ سہل کام نہ تھا.... وہ کبھی ایک کو الگ کرتا کبھی دوسرے کو کھینچتا..... کسی کی جھوٹ موٹ سرزنش کرتا، کسی کو پیار سے پچکارتا.... اور کسی کسی کو خاص طور پر وہ کہ جو عمر میں چھوٹا ہوتا یا زخمی لاچار ہوتا اسے گود میں بھی اٹھا کر چلنا پڑتا۔ کہاجا سکتا ہے کہ اس میں چرواہے کو کبھی کسی ذہنی اذیت یا جسمانی مشقت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ مگر حیرت اس میں تھی کہ کتے کو یہ سب کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا پھر بھی ریوڑ چراہ گاہ پہنچ جاتا تھا۔ بغیر کہیں راستے میں رکے۔ ناک کی سیدھ میں.... سہما ہوا دبکا ہوا....

سہما ہوا دبکا ہوا بھیڑ بکریوں کا ریوڑ اب کتے کے سپرد تھا.... ایک زمانہ تھا جب چرواہا آگے آگے چلتا اور کتا پیچھے پیچھے زمین کو سونگھتا کان لٹکائے دم گرائے ہوئے.... اور ایک زمانہ تھا جب کتا دن بھر گھاس پر پڑا اونگھا کرتا اور چرواہے کو فرصت کا ایک لمحہ نہ تھا....

اب معمول بدلنے لگا تھا.... کتا آگے آگے چلتا.... کان اٹھائے دم اکڑائے ہوئے- اور چرواہا پیچھے پیچھے- کتا دن بھر بھیڑ بکریوں کو ایک حد میں رکھنے کی کوششوں میں رہتا اور چرواہا گھاس پہ پڑا اونگھا کرتا......

چرواہے کے لئے اپنا اختیار کتے کو سپرد کرنے میں ابتدا" کچھ جھجک ضرور تھی مگر پھر رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی- اس نے یہ جانا کہ بھیڑ بکریاں چرانے میں کچھ مشکل نہیں تھی اک ذرا سا کام تھا- اب وہ اندازہ کر سکتا تھا کہ جس قدر زیادہ کتے ملکیت میں ہوں اسی قدر زیادہ بھیڑ بکریاں چرائی جاسکتی ہیں- بلکہ دنیا بھر کی بھیڑ بکریوں پر حکمرانی ممکن ہے.... ایسی حکمرانی کہ جس کا عرصہ پوری فراغت سے اونگھ کر بسر کیا جاسکتا ہے- اس احساس پر وہ ایک روز بہت محظوظ ہوا اور دیر تک بیٹھا ہنستا رہا کہ وہ تو ساری زندگی بس کتوں کے کرنے کے کام کرتا رہا ہے-

بھیڑ بکریوں سے زیادہ مضحکہ خیز جانور کوئی نہیں.... اب جب وہ انہیں گھاس پہ پڑے پڑے دیکھتا تو ہنس دیتا-- پہلے اس نے انہیں دور سے کبھی نہیں دیکھا تھا- وہ کتے سے ڈر کر جب بھاگتیں تو ایک دوسرے کی ٹانگوں میں گھسنے کی کوشش کرتیں- بھیڑوں کے بھاگنے سے ان کی چکیاں ان کی پچھلی ٹانگوں پر دائیں بائیں ہلتیں تو عجب مضحکہ خیز منظر ہوتا.... جب کتا کسی بکری کی دم کے قریب آکر بھونکتا تو وہ اپنی دم کی حفاظت میں دائرے میں گھومتی- اور کوئی کوئی بکری یوں ہی کان لٹکائے کھڑے کھڑے اپنے ہی سائے کو کتا سمجھ کر بدکتی تو ہنسی چھوٹ جاتی..... یہ منظر اس نے پہلے کیوں نہ دیکھے تھے..... یہ منظر اب وہ محظوظ ہونے کو اکثر دیکھتا- بلکہ کتے کو کبھی کبھی بلا مقصد بھی کسی بھیڑ یا بکری کے پیچھے بھگاتا- وہ ممیاتی اور چلاتی ہوئی اپنے بے ڈھب جسم کے ساتھ جب بھاگتے میں ادھر ادھر جھولتی تو خوب ہنسی کا سامان ہوتا..... کبھی کبھی تفنن طبع کے لئے اسمیں کیا مضائقہ تھا-

کیا مضائقہ تھا کہ اب ہر اس چیز کو اور طرح سے دیکھا جاتا کہ جسے پہلے اور طرح سے دیکھنے کی فرصت نہ تھی- کیا حرج تھا کہ کبھی کبھی آدمیوں کا بھی نظارہ کیا جاتا بھیڑ بکریوں کو بھول کر......

آدمیوں سے اس کا تعلق بڑا واجبی سا رہا تھا..... کھیتوں اور کھلیانوں پر..... گلیوں اور

مکانوں میں آدمی بس ایک عکس کی صورت جھلکتے تھے اور سب سائے تھے....... مگر اب فرصت کے دنوں میں ہر شے روشن ہونے لگی تھی- وہ پگڈنڈی جو بستی کو شہر سے ملاتی تھی اس سے بھی ہر طرح کا آدمی گزرتا تھا..... بڑے دلچسپ منظر تھے..... چھوٹے بڑے آدمی ..... بھکاری اور مزدور...... رزق کے طالب ...... علم کے طالب .... گاڑیوں پر .... سائیکلوں پر .... اور پیدل-

کسی تہوار پر.... عرس پر.... یا شہر میں کسی جلسہ جلوس کی غرض سے جب آدمی جوق در جوق نکلتے اور پگڈنڈیوں پر پھیل کر آگے بڑھتے یا نشیب سے اترتے یا میدانوں سے گزرتے تو ایک ریوڑ لگتا.... آدمیوں کی شکل میں بھیڑ بکریاں.......

آدمیوں کی شکل میں بھیڑ بکریاں اور آدمیوں کی شکل میں کتے .... اب یہ سب اس کے تخیل کی کارفرمائی تھی...... یہی سبب تھا کہ جب کبھی شام کو اب وہ ریوڑ کے پیچھے جھونپڑی میں لوٹتا تو اس کے دماغ میں بھیڑ بکریوں کے علاوہ آدمی بھی ہوتے...... خواب دیکھتا تو ممیانے کی آوازوں کے ساتھ آدمیوں کا شور بھی شامل ہو جاتا اور ساری بستی .... ساری دنیا اس کے باڑے میں بدل جاتی.......

آدمی ہوتے جن کے سر بھیڑ بکریوں جیسے ہوتے...... وہ ہوتا جس کا قد آسمان کے ساتھ چھو رہا ہوتا...... اور کتے ہوتے چابکیں لہراتے قہقہے لگاتے.......

تو اب دن اور رات کا معمول بدل گیا تھا..... اس کا بھی اور کتے کا بھی ... دنیا کو اور طرح سے دیکھنے کی فراغت ہوگئی تھی جب کہ کتے کو اور طرح کی مصروفیت ہاتھ آگئی تھی...... بھیڑ بکریوں کا کام چرنا پھرنا تھا صبح سے شام تک.......سو وہ اب بھی حاصل تھا بس تھوڑے سے فرق کے ساتھ ..... اب چرواہا ہمہ وقت ان کے ہمراہ نہیں تھا..... ہمراہ تھا کتا ہانپتا ہوا بھونکتا ہوا..... خوف زدہ کرتا ہوا..... چرواہے کی سب ناز برداری اب کتے کے لئے تھی بھیڑ بکریوں کے لئے نہیں.......

کتے نے بہت دنوں میں جو نیا چلن سیکھا تھا اس نے اسے اپنے عمل میں کافی حد تک آزاد کر دیا تھا..... سچ تو یہ ہے کہ اب اسے چرواہے کی کوئی ایسی خاص حاجت نہیں رہی

تھی۔ اور نہ ہی اب وہ اس کی خوشنودی کے لئے بھیڑ بکریوں پر مامور تھا...... بلکہ ایک طرح کی حاکمیت تھی جس کے مزے میں تھا..... چرواہے کا عمل دخل اب برائے نام تھا..... کتے کا جی چاہتا تو وہ چرواہے پر بھی بھونک لیتا۔

چرواہے کو فراغت کی جو سہولت حاصل ہوئی تھی وہ اسے گنوانے کو تیار نہ تھا اسی لئے وہ اسے اب ڈانٹنے یا روڑہ کنکر مانے کی بجائے پیار سے پچکارنے پر اکتفا کرتا اور اپنے خواب و خیال میں کھو جاتا.......

چرواہے کی محتاجی سے نکلنے کے بعد ایک عجیب بات یہ بھی رونما ہونا شروع ہوئی کہ کتے نے اپنے اوقات کا تعین خود کرنا شروع کر دیا..... اب لازم نہیں تھا کہ وہ منہ اندھیرے ہی ریوڑ کو لے کر نکل کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ جب باڑے میں بھیڑ بکریاں اکٹھی ہو چکی ہوتیں اور چراہ گاہ کو چلنے کے لئے بیتاب ہوتیں وہ راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا یا باڑے کے ارد گرد چکر لگاتا اور انہیں نکلنے نہ دیتا وہ چلاتیں ' ممیاتیں ایک دوسرے کو دھکیلتیں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتا۔ اور کہیں دیر سے سفر شروع کرنے کی اجازت دیتا اور کبھی کبھی یوں بھی کرتا کہ خلاف معمول دن ڈھلنے سے پہلے ہی انہیں چراہ گاہ سے باڑے کی طرف ہانک دیتا..... وہ سہما ہوا دبکا ہوا خوف زدہ ریوڑ اس کے آگے دم نہ مار سکتا تھا۔ تا وقتیکہ وہ منحوس گھڑی نہ نمودار ہو گئی جو کبھی کبھی کسی کسی کا نصیب بن جاتی ہے۔

یہ اس دن کا قصہ ہے جس روز چرواہے نے چراہ گاہ کا رخ نہیں کیا۔ اس میں کچھ بھی عجیب نہیں تھا۔ چرواہا اب اکثر بے قاعدگی ہی سے دکھائی دیتا تھا اس لئے کہ اب اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ تو اس صبح بھی وہ ہمراہ نہیں تھا۔ شاید بہت سارے کتوں کی تلاش میں تھا یا بہت ساری بھیڑ بکریوں کی۔ دوپہر ہو گئی تھی۔

دوپہر ہو گئی تھی مگر ابھی دن نہیں ڈھلا تھا اور ابھی جانور چرنے پھرنے سے فارغ نہ ہوئے تھے لیکن کتے کے جی میں جانے کیا آئی کہ اس نے ناوقت ہی واپسی کا ارادہ کر لیا کہ اس کا ارادہ اس کی مرضی پر تھا۔

واپسی کا سفر کبھی مشکل نہیں ہوا تھا۔ ایک وقت تھا کہ جب بھیڑ بکریاں چر لیتیں تو خود

ہی اپنی اپنی جگہ گھاس سے منہ اٹھا کر کھڑی ہو جاتیں اور کان لٹکا لیتیں یا ایک دوسرے کے قریب آآ کر ٹولیاں بنا لیتیں پھر چرواہا ایک ہلکا سا ہنکارا بھرتا اور وہ ریوڑ کی شکل اختیار کر کے اپنے راستے پر ہو لیتیں۔ لیکن آج ایسا نہیں تھا.....

آج ایسا تھا کہ کتا ناوقت ہی ان کے ارد گرد بھاگنے بھونکنے اور انہیں اکٹھا کرنے کے جتن میں مصروف ہو گیا۔ بھیڑ بکریاں اس کے قریب آنے اور قریب آکر بھونکنے پر بدکتیں، بھاگتیں ایک دوسرے کے قریب آتیں مگر پھر الگ الگ ہو کر گھاس چرنے یا درختوں کی جھکی ہوئی شاخوں کو اچکنے میں مگن ہو جاتیں لیکن اس راستے کی طرف نہ جاتیں جو واپسی کا راستہ تھا........ انہوں نے بہت دن اس کے ساتھ گزار لئے تھے اس عمل سے کچھ مانوس سی تھیں اور پھر ابھی کون سی ایسی شام ہوئی تھی.... وہ اسے اس کی معمول کی ناراضگی ہی خیال کرتی رہیں.... کتا اس پر مشتعل تھا....

وہ مشتعل کتا دیر تک اپنی کوشش میں لگا رہا... مگر اس عمل میں نہ اسے خبر ہوئی نہ بھیڑ بکریوں کو کہ وہ رفتہ رفتہ کھسکتے ہوئے اپنی چراہ گاہ سے اور اپنے راستے سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ وہ دور ہو رہے تھے کچھ چٹیل میدان کی سی صورت تھی.... جب منہ مارنے کو زمین کم ہو گئی تو بھیڑ بکریوں نے ناچار ریوڑ کی شکل اختیار کرنا شروع کر دی۔ اب وہ اور کیا کرتیں۔ کتا بالآخر اپنے عمل میں کامیاب ہو رہا تھا۔

تو اب معمول کے مطابق سب کتے کے رحم و کرم پر تھے سوائے ایک بھیڑ کے کہ جس نادان کو شام سے پہلے لوٹنا اب بھی قبول نہیں ہوا تھا۔ وہ تھوڑی دیر اپنے گروہ کے ساتھ چلی تو ضرور مگر پھر ایک جگہ رک کر ایک جھاڑی کے ساتھ مصروف ہو گئی یہ ایک ناقابل برداشت منظر تھا۔ کتا پلٹ کر اس کی طرف لپکا مگر جیسے بھیڑ کو بھی اس کی چال کا پہلے سے علم تھا وہ خلاف توقع اس کی طرف رخ کر کے تن گئی..... خشمگیں نظروں سے دیکھا اور اگلا ایک کھر زمین پر مار سر کو دائرے میں گھمانے لگی۔ یہ حملے کی تیاری تھی۔ کتے کے لئے یہ ایک بالکل ہی مختلف صورت حال تھی بدک کر پیچھے ہٹا اور حیران سا ہو کر کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا.... مگر وہ نہیں جان سکتا تھا کہ ہجوم میں کوئی ایک ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس کی فطرت میں

کبھی کبھی انکار بھی سر اٹھالیتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی اکثر ..... تو وہ ایک ایسی ہی بھیڑ ثابت ہوئی تھی..... اور اب کتا اس سے دور کھڑا بھونک رہا تھا اور قریب آنے میں جب تھا۔ بھیڑ بھی کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر اسے بھول کر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ کتے نے اسے مصروف دیکھا تو بھونکنا ترک کیا اور چوروں کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا۔ آج اسے خلاف معمول کچھ اور حربوں سے بھی کام لینا پڑ رہا تھا.... آگے بڑھا اور اس کے پچھلے قدموں پر حملہ آور ہو گیا بھیڑ اس اچانک کے حملے کو سمجھ نہ سکی بس اپنی مدافعت میں پلٹی اور اس سے ٹکرا گئی.... وہ گرا اور کرلاتا ہوا پیچھے ہٹا مگر شکست تسلیم نہ کی۔ کچھ دیر بعد پھر اس کی طرف بھاگا۔ وہ پھر سنبھلی۔ یہ عمل کچھ دیر ہوا ہوگا کہ پھر بھیڑ کا فطری خوف اس پر غالب آیا اور وہ بدک کر اپنے گروہ کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی..... ریوڑ ہر چیز سے بے نیاز کسی انجانی منزل کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا اور وہ اس میں روپوش ہونے کو بھاگی چلی آرہی تھی..... کتا اب شیر تھا۔ وہ بدکی ہوئی ڈری ہوئی بھیڑ بالاخر اس کے رحم و کرم پر آگئی تھی۔ وہ اسے جالینا چاہتا تھا...... بھیڑ نے اپنی پوری قوت صرف کی اور جست بھرتی عقب سے ریوڑ میں دھنستی چلی گئی جو آپس میں جڑ کر جلوس کی شکل میں بڑھا چلا جارہا تھا۔ کتے نے بھی جست بھری اور ریوڑ کے اندر کو دگیا اس کے تعاقب میں کہ آتش انتقام سے لبریز تھا مگر اس کم نصیب کو خبر نہ ہوئی کہ یہ اس کی آخری جست تھی.....

کتے نے جب پیچھے سے ریوڑ میں داخل ہو کر اس بھیڑ کو تلاش کرنا چاہا تو ریوڑ میں کھلبلی مچ گئی اور وہ افراتفری میں بھاگ کھڑا ہوا.....زمین پر جیسے بھونچال آگیا............ ان کے قدموں کی دھمک پر طبل جنگ کا گماں تھا جس سے زمین و آسمان گونج اٹھے۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے غول در غول اڑے اور چیختے ہوئے بلند ہوتے چلے گئے۔ گرد و غبار دھول کا بادل تھا جو یکدم چاروں طرف چھا گیا..... یہ عجیب صورت حال تھی۔ بھیڑ تو اسے فراموش ہوئی اب تو ریوڑ سے باہر نکلنے کا راستہ درکار تھا کہ چاروں طرف سے بھیڑ بکریاں اس سے ٹکراتی پھر رہی تھیں۔ پھر معلوم نہیں کس وقت اس نے خود کو ان سے الگ پایا۔ اب اس بکھرے ہوئے ہجوم کو روکنے اور پھر سے منظم کر کے کسی راستے پر ڈالنے کی ضرورت تھی

اسی لئے وہ حسب عادت ان کے دائیں بائیں گھومنے لگا اور ان کو روکنے لگا مگر ریوڑ کی رفتار تو بڑھتی ہی جارہی تھی۔ وہ آخری حربے کے طور پر جست بھر کے ان کے سامنے آیا اور پچھلے قدموں پر کھسکتا ان کے آگے بھونکنے لگا..... مگر بھگدڑ کا عالم ہو تو سامنے کے منظر روپوش ہو جاتے ہیں...... سر جھکا کر چلنے والی بھیڑ بکریوں کے علم میں نہیں تھا کہ کتا ان کے سامنے ہے دائیں ہے یا بائیں۔ وہ تو بھاگتی جارہی تھیں۔ کسی انجانے خطرے سے بچنے کے لئے..... یوں ہی بھاگتے بھاگتے وہ اس کے سر پر پہنچیں اور پھر اس کا سر کسی بکری کے پاؤں میں الجھ گیا اور کوئی بھیڑ اس کے اوپر سے گزر گئی۔ بھگدڑ میں اضافہ ہو گیا۔ افراتفری بڑھ گئی.... پھر اس بدنصیب کتے نے اٹھنے کی بہت کوشش کی... مگر وہ آخر کس کس کے قدموں کو روکتا آگے نشیب تھی اور ریوڑ گرتا پڑتا اسی طرف لڑھکتا جارہا تھا اسے کچلتا ہوا روندتا ہوا حتی کہ اس کی حکمرانی کا دن ڈھل گیا اور شام ہو گئی....

شام ہوئی تو چرواہے نے اپنے جھونپڑے سے جھانک کر اس راستے کو دیکھا کہ جس پہ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ آیا کرتا تھا..... پھر تشویش ہوئی تو اٹھا اور چراہ گاہ کی طرف چل پڑا....... راستہ سنسان تھا اور سبزہ زاز پر ویرانی تھی اب شام بھی ڈھل چکی تھی اور رات کا چاروں طرف اندھیرا تھا..... اس نے کتے کو بہت آوازیں دیں مگر کسی سمت سے اس کے غرانے یا بھونکنے کی آواز سنائی نہ دی..... البتہ کہیں دور سے بہت دور سے کچھ اور آوازیں ضرور آتی تھیں.... جیسے بھیڑ بکریاں ممیاتی ہوں مگر سمت کا اندازہ نہیں ہوتا تھا...... پھر اس نے ہنکارا بھرا..... اس خیال سے کہ اس کی آواز پر ریوڑ پاس آکر اکٹھا ہو جائیگا مگر ایسا نہیں ہوا....... شاید اب اس کی آواز ان کے لئے مانوس نہیں رہی تھی......تو اس نے بھیڑ بکریوں کو کھو دیا تھا.... اور اس کتے کو بھی جو بہت وفادار تھا..... اور بستی والے اس کی تلاش میں تھے......

تو یہ اس کتے کی کہانی تھی جسے بھیڑ بکریوں پر حکمرانی حاصل ہوئی...... اور اس چرواہے کی بھی جس نے بعد از خرابی بسیار یہ عبرت حاصل کی کہ بھیڑ بکریاں تو بھیڑ بکریاں ہی ہوتی ہیں انہیں ہمیشہ ایک چرواہے کی ضرورت رہی ہے مگر یہ کام کسی کتے کے سپرد نہ ہی ہو تو بہتر ہے..........

کبوتر

وہ پرندہ جو ابتدا میں اپنی اسیری پر بہت ملول تھا اب نہیں ہے۔ آغاز میں اس کی پھڑپھڑاہٹ دیکھنے لائق تھی۔ وہ اڑنے کے جتن میں پنجرے کی دیواروں اور چھت سے ٹکراتا، لڑکھڑاتا، گر پڑتا۔ وہ اس اسرار پر حیران تھا کہ کھلی آزاد فضائیں اس کی دسترس سے یک لخت باہر کیسے ہوگئی تھیں۔ کئی گھڑیاں اس طرح گزار کر آخر اسے ملول ہونا تھا سو وہ ہوا۔ دانا نہ چگا پانی نہ پیا۔ وہ رات اس نے پروں میں سر دیے کے نہیں گزاری۔ ہر آہٹ پر چونکتے سر گھماتے آنکھوں میں کاٹی۔ کہیں ارد گرد کوئی چہچہے بھی تھے۔ جو بلاتے بھی تھے مگر راہ میں دیوار تھی۔ کہاں جاتا۔ کیا کرتا۔

وہ بھی کیا رت تھی۔ جب شاخ شاخ جھولنے، اڑنے پھرنے کی آزادی تھی، ندی نالوں پر پرواز کرنے دور نکل جانے اور پھر لوٹ آنے کا اختیار تھا۔ گھروں کی منڈیروں پر اترنے، چہکنے صحنوں میں آبیٹھنے اور آہٹ پر کر اڑ جانے میں کیسی لذت تھی۔ پروں کی دسترس میں آسمان تھا۔ اور آسمان کیسی کشش رکھتا تھا۔ یہ بلندی پر پھیلنے اور پھیلتے ہی رہنے کا کھیل کہاں رہ گیا اور کہاں رہ گئی تھی وہ پرواز جو کبھی اختیار ہی میں نہ آتی تھی۔ یہاں تو سمٹنے اور سکڑنے کا بھی کوئی مقام نہ تھا۔ کسی جکڑنے والے پنجے کا انتظار کرنا چاہئے تھا۔ تو پرندے کے وجود میں لرزش ہوتی تھی۔ اور کسی نجس گھڑی کے انتظار میں موسم گزرتے جاتے تھے۔ لیکن کوئی ہمیشہ ایسے کیونکر گزارے، وہ آدمی ہو یا پرندہ ڈھنگ بدلنا پڑتے ہیں۔ سو اس نے بدلا۔ دن بیتے جب اس نے پھڑ پھڑانا ترک کیا۔ بہت بے چین ہوتا تو کچھ بول لیتا جیسا کہ پرندے بولتے ہیں۔ دانا پانی میسر تھا۔ سو ان پروں میں سر دے کر سونے کے سوا چارہ نہ تھا۔ جو اب اڑنے کو ترستے تھے۔ جیسے تیسے بسر کرنا تھی۔

ایک دن ایک بلی کھلے دروازے سے اندر آئی۔ یوں کہ جیسے انتظار ختم ہوا۔ وہ لمحہ آیا تھا جو نہ آتا تو اچھا ہوتا۔ وہ سر اٹھا اٹھا گھما گھما اس کی ہر حرکت دیکھنے لگا۔ بلی ادھر ہی کو لپکی تھی۔ برے یا بھلے دن کٹ رہے تھے اب کوئی مصیبت سر پر کھڑی تھی۔ پنجرہ ذرا بلندی پہ تھا۔ بلی سر اٹھا اس کے روبرو کھڑی غرانے لگی' پرندہ اسکے سوا اور کیا کرتا' بدحواسی میں ادھر ادھر پھڑپھڑانے لگا۔ پھڑپھڑاتا رہا۔ جیسے کوئی اس پر جھپٹ رہا ہو۔ ادھیڑ رہا ہو۔ بکھیر رہا ہو۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ کچھ پل گذرے جب وہ رکا' حیران ہوا۔ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا جو غرا تو رہی تھی۔ مگر پہنچ نہیں پا رہی تھی۔ معذور تھا مگر بلی کی دسترس سے بھی باہر تھا۔ اسے اطمینان ہوا۔ اطمینان ہوا تو اس نے بھی اپنی گردن کو پھلا لیا اور ایک پاؤں پنجرے کے فرش پہ مارتا بولنے لگا۔ جیسا کہ پرندے آپس میں لڑتے ہیں تو بولتے ہیں۔ پنجرے کی حفاظت میں بیٹھ کر بل کھانے اور غصے میں آکر بولنے میں کیا مضائقہ تھا۔ بلی نے اسے اس عالم میں آتے دیکھا۔ حیران ہوئی۔ کچھ دیر رکی۔ پھر کسی اور سمت ہولی۔ پرندے نے اسے جاتے دیکھا تو سکھ کی سانس لی۔ یہ سکھ کی سانس بھی کئی دنوں میں میسر آئی تھی۔ گھر کے بچوں نے بھی یہ تماشا دیکھا تھا اور مسرور ہوئے تھے۔ پھر وہ یہ تماشا روز کرنے لگے۔ بلی روز آتی تو وہ روز سکھ کی سانس لیتا۔ جب نہ آتی بولایا رہتا۔ وہ آدمی ہو یا پرندہ دل بہلانے کو کوئی حیلہ چاہئے کہ ہر کھیل کی اپنی ایک لذت ہے۔ پنجرے کی حفاظت میں بل کھانا اور غصے میں آکر بولنا بھی کیا برا تھا۔

وہ پرندے جو مزاروں پر بسیرا کرتے ہیں۔ گنبد و مینار پر اترتے ہیں۔ اور وہ پرندے جو شاخ شاخ جھولتے ہیں۔ اور ندی نالوں پر چہکتے ہیں۔ جزیروں کی خبر لانے والے سمندری پرندے اور پرندوں پر جھپٹنے والے پرندے۔ سب پابند ہیں کوئی آزاد نہیں۔ آسمان اور زمین کے درمیان ایک پنجرے میں پھڑپھڑاتے ہیں۔ یہ تو یونہی گمان ہوتا ہے کہ وہ اڑتے پھرتے ہیں شاخ شاخ جھولتے ہیں اور آزادی کے گیت گاتے ہیں۔ کھلا نیا آسمان فراموش کر دینا چاہئے جب پنجرے کی مضبوط جالیوں کے بیچ کوئی خطر نہ ہو۔

زندگی کا معمول ایک سا نہیں رہتا۔ طبیعت کے رنگ بھی بدلتے ہیں۔ وقت بھی

بدلتا ہے۔ پنجرے میں بند پرندے ہوں یا آدمی ہمیشہ توجہ میں کب رہتے ہیں۔ کبھی کبھی نگاہ چوک بھی جاتی ہے۔ کسی کی لاپرواہی یا بے احتیاطی سے ایک روز پنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا۔ وہ کھلے دروازے پہ آیا۔ کچھ دیر رکا رہا۔ باہر جائے کہ نہ جائے۔ دل میں یونہی ایک وسوسہ ٹھہرا ہوا تھا۔ مگر پھر بے دھیانی میں آپ ہی آپ جست کر آیا۔ سامنے کوئی نہ تھا۔ صحن میں کمروں میں ہر طرف گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ وہ گھومتا رہا اور ڈھونڈتا رہا۔ مگر یہ سوجھتا نہ تھا کہ تلاش کس کی ہے۔ منظر جب حافظے سے اترتے ہیں تو شریانوں میں سر کتے ہیں۔ خون کی گردش کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مگر یاد نہیں آتے۔ آدمی اور پرندے اس حساب سے یکساں ہیں۔ بس کوئی اپنا ہونا جلدی فراموش کرتا ہے۔ کوئی رفتہ رفتہ۔ بھولی ہوئی دنیا کے نشان البتہ وجود پر کہیں رہ جاتے ہیں۔ جب کہیں کچھ مانوس سا ہوتا ہے تو دل اڑنے کو چاہتا ہے ۔ اوپر پرندے شور کرتے گذرتے جا رہے تھے۔ وہ ٹھہر کر کچھ سننے لگا۔ اوپر بہت دور کہیں بلندی پر اک چھت تھی۔ چھت تھی کہ آسمان تھا۔ بہت ہی دور اور بلند۔ اس نے پر کھول لئے، پھیلا لئے پھر دیر تک اوپر دیکھتا پھلانگنے کی خواہش کرتا رہا۔ مگر پنجے زمین سے جدا نہیں ہوئے۔ پھر کہیں کوئی آہٹ ہوئی۔ وہ بدک گیا سمٹ گیا۔ سمٹنے اور سکڑنے کو زیادہ جگہ درکار نہیں ہوتی۔ بس ذرا سا سر نیہوڑانا ہوتا ہے۔

پنجرے کے کھلے دروازے پر جب کسی کی نگاہ پڑی تو شور مچ گیا۔ پنجرہ خالی تھا۔ بچوں کے چہرے اتر گئے۔ بڑوں کو بھی پریشانی ہوئی۔ تلاش بیکار تھی۔ پرندہ تھا۔ اڑ گیا ہوگا۔ پھر ایک وقت کسی نے دیکھا وہ اڑا نہ تھا۔ ایک چارپائی کے پائے کے ساتھ لگا چپ چاپ بیٹھا تھا۔ سب مطمئن ہوئے کچھ دیر بعد خود ہی آیا ٹہلتا ٹہلتا چلا اور جست کر کے پنجرے میں داخل ہوا۔ برتن میں پڑا دانا دنکا چگنے لگا۔ سب کے چہرے کھل اٹھے۔ اسے کھلا نیلا آسمان فراموش ہوا تھا۔

اس دن کے بعد پنجرے کا دروازہ بند کرنے کی قید ختم ہوئی۔ آخر پرندہ تھا۔ تھوڑی سی کھلی فضا اسے بھی درکار تھی یوں بھی اب وہ مانوس ہو چکا تھا۔ کہاں جانا تھا اسے۔ عام خیال تھا کہ اگر اڑ کر دور بھی چلا گیا تو لوٹ آئے گا۔

جب دروازے کی قید نہیں تو پھر پنجرے کی کیا حاجت ہے۔ البتہ پڑا رہے ایک طرف تو اس میں حرج بھی کیا ہے اب وہ ادھر ادھر جست کرنے کو آزاد تھا۔ اس لئے کہ اب تو وہ گھر ہی اس کا جنگل تھا۔ ہرا بھرا درختوں اور جھاڑیوں سے سجا۔ اس کے سوا ادھر ادھر اور کیا ہوگا۔ کہ سب منظرسے منظر بدلنے کی بات ہے۔ یہ منظر سے منظر کون بدلتا ہے جنگل کو گھر اور گھر کو جنگل کون بناتا ہے۔ یہ آدمیوں کے فکر کرنے کے معاملے تھے۔ پرندے کے وجود میں تو بس اک ذرا لرزش ہوتی تھی کبھی کبھی۔ پھر شام تک بہلنے کے بہت سلسلے تھے جب بچے کھانا کھانے بیٹھتے یا پڑھتے ہوتے وہ آکر ان کے کندھوں پر بیٹھ جاتا اور ادھر ادھر پیار سے چونچیں مارتا۔ وہ کھلکھلا کر ہنستے اور پیار سے گود میں بھر لیتے۔ رات البتہ اسے موسموں کی سختی سے محفوظ رکھنے کی خاطر پنجرے میں بند کردیا جاتا۔ آخر آدمی بھی سونے سے پہلے دروازے کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں۔

یہ بچوں کی سوچنے کی بات ہے کہ پرندے کہاں سے آتے ہیں اور کس سمت کو جاتے ہیں اور ان کے ٹھکانے کہاں مقرر ہیں۔ شاید یہ آسمانوں سے آتے ہوں اور ادھر ہی کو لوٹ جاتے ہوں۔ یا شاخوں سے نکلتے ہوں پھولوں اور پتوں کی طرح جیسے کونپلیں پھوٹتی ہیں ....یہ مکتب کی کتابوں میں لکھا ہے کہ آسماں پر پرندے اور زمین پر آدمی سب آزادی کے استعارے ہیں مگر کیا آدمی بھی پنجرے میں بند کئے جاسکتے ہیں۔!

بچوں نے اس شام بہت سوچا اور پریشان ہوئے کہ انھوں نے ایک پرندے کو اس کے آسمان سے جدا کر دیا تھا۔ اور پھر اس رات خواب میں ایسے ملک دیکھے جہاں شاہی دربار میں ایسے پنجرے رکھے تھے جن میں آدمی پا بہ سلاسل تھے اور ان کی حفاظت پر خونخوار درندے مقرر تھے۔ وہ صبح بچوں کے لئے خوف لے کر آئی۔ وہ بہت دیر اداس بیٹھے رہے۔ انہیں پنجرے سے وحشت ہوئی اور انھوں نے پرندے کو دور اپنے آشیانے کی طرف اڑانے کا ارادہ کر لیا۔

بچوں کو یہ علم نہیں ہوتا کہ پالتو پرندوں کو نہیں اڑانا چاہئے کہ ان کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہیں ہوتا۔

وہ بے خبر اسے چھت پر لے آئے اور منڈیر پہ بٹھا دیااور اس کے اڑنے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر اس وقت انہیں بہت دکھ ہوا جب انہوں نے دیکھا کہ پرندہ جست کرکے منڈیر پر تو آبیٹھا مگر اڑا نہیں۔ وہ ہاتھ جھلاتے اسے اڑاتے ہے مگر وہ ادھر ادھر پھلانگتا رہاکہ ایسے کھیل وہ روز کھیلتا تھا۔ جب بچے تھک ہار گئے تو سیڑھیاں اتر کر گلی میں نکل گئے۔ یہ ان کے کھیلنے کودنے کا وقت تھا۔ پرندہ منڈیر پر تنہا کھڑا رہ گیا۔

چاروں طرف آسمان تھا۔ اور پرندوں کے چہچہے تھے۔ ہر چیز نئی تھی۔ وہ سرشار ہوا تو یونہی بے ارادہ جسم جھکایا جیسے اڑنا چاہتا ہو۔ مگر جب سر اٹھایا تو ایک مرتبہ یوں محسوس کیا جیسے اوپر آسمان نہ ہو۔ کوئی چھت ہو جس سے ٹکرا کر گرنے کا اندیشہ تھا ہمت جواب دے گئی نیچے سامنے صحن بھی تھا جہاں پنجرہ تھااور وہی آشیانہ تھامگر گہرائی بہت تھی گرنے کااندیشہ تھا۔ وہ ادھر ادھر ٹہلتا جھک کر دیکھتا پھر مایوس ہو جاتا۔ پرندے سر پر سے شور مچاتے گذرتے جاتے تھے مگر اسے معلوم نہیں ہوتاتھاکہ یہ کون مخلوق ہے اور کدھر جاتی ہے۔

آوارہ کتے گلیوں اور سڑکوں پر بھونکتے پھرتے ہیں اور بلیاں گھروں کی چھتوں اورمنڈیروں پر منڈلاتی ہیں۔ سب اپنے اپنے شکار کی تاک میں ہوشیار رہتے ہیں وہ بلی بھی بوپاکر آئی اور پھراس نے اسے چھت پر منڈلاتے دیکھ لیا۔ رک کر غرائی۔ پرندے کا اس سے یہ روز کا کھیل تھا۔ مگر اب کھیل کی صورت اور تھی۔ اس وقت تو وہ پنجرے میں محفوظ نہیں تھااس کے پنجے کی دسترس میں تھا۔ اس لئے پھڑپھڑاتا ہی رہا۔ اسے ان مہربان ہاتھوں کا انتظار تھاجو آتے اور سمیٹ کر پنجرے کی دیواروں میں محفوظ کردیتے۔ مگر اب تو سامنے بلی کا پنجہ تھا۔ جب راستے بند ہوئے تو کچھ دیر پھڑ پھڑا کر رکا آنکھیں بند کیں اور اپناپنجرہ آپ ہوگیا۔

بھلا اور وہ کیا کرتا ہر چند وہ چاہتا تو اڑ سکتا تھا اور حالانکہ بلی نہیں اڑ سکتی تھی۔ مگر وہ فیصلہ نہیں کرپا سکا تھاکہ پر اڑنے کے لئے ہوتے ہیں یا محض پھڑپھڑانے کے لئے ۔ وہ آدمی ہوں یا پرندے جب اڑنے کی عادت بھول جائیں تو آخر آخر آنکھیں بند کرلیتے ہیں اور اپنا پنجرہ آپ ہوجاتے ہیں۔

کوّے

کووں سے ہمیں کوئی کام نہ تھا۔ ہم ان کے لئے وہاں نہیں جایا کرتے تھے۔ وہ تو یونہی درمیان میں آ گئے۔ ہماری ایک بلی تھی جو اپنا حافظہ کھو بیٹھی تھی۔ ہم جنگل میں اسے دودھ پلانے جایا کرتے تھے۔ یہ جنگل ویسا نہ تھا جیسے ویرانوں میں ہوتے ہیں۔ جہاں درندوں کا بسیرا ہوتا ہے اور جہاں راستوں سے گذرنا اور قیام کرنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ محض درختوں کا ایک جھنڈ تھا جو آبادی کے قریب ہی اس کے عقب میں واقع تھا۔

ہماری جو بلی تھی وہ ایک ٹھگنے سے ٹنڈ منڈ درخت کی چوٹی پر جو کٹائی کے باعث ایک چوکی کے مانند تھی بیٹھی رہتی اور آنے جانے والوں کو ٹر ٹر دیکھا کرتی۔ شروع شروع میں اس کے سبب پرندوں میں بہت ہیجان رہا۔ وہ اتنا شور کرنے لگے جیسے کوئی قیامت ٹوٹ پڑی ہو مگر پھر سب ایک دوسرے کے عادی ہو گئے۔ بلی سے کسی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ وہ حافظہ کھو بیٹھی تھی اور اسے یہ یاد نہیں رہا تھا کہ اس کا ایک کام پرندوں پر جھپٹنا بھی ہے۔

پرندے لا تعداد تھے۔ ان کی آوازوں سے جنگل بھرا رہتا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی حیات تھی اور اپنی اپنی آوازیں تھیں۔ مگر وہ آوازیں ایسی آپس میں گھلی ملی رہتیں کہ کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ حالانکہ وہ الگ الگ بھی شناخت ہوتی تھیں۔ مگر ہم ان کو اکٹھا ہی سنتے تھے۔ پرندوں کا چہچہانا اچھا لگتا تھا۔

پرندوں کا چہچہانا اچھا لگتا تھا اک سوائے شام کے۔ شام کو تو شور پڑ جاتا۔ چڑیاں جو دن بھر چہچہاتی سنائی دیتی تھیں ان کی آواز ڈوب جاتی۔ بس کوے بولتے۔ بولتے رہتے۔ کائیں کائیں۔ کائیں کائیں۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ سارا ماحول سیاہ پڑ جاتا۔ معلوم نہیں اتنے کوے کہاں سے آجاتے تھے۔ دن میں بھی وہ ہوتے تھے مگر اتنی بڑی تعداد تو دکھائی

نہیں دیتی تھی۔ ایسا شاید قبرستان قریب ہونے کے باعث تھا۔ جنگل کی دوسری طرف قبرستان ہی تو تھا۔ قبرستان قریب ہو تو کوے زیادہ دور نہیں ہوتے۔ شام کو کوے صرف درختوں پر نہیں اترتے تھے۔ قبروں پر بھی اترتے تھے۔ بتایا گیا تھا کہ مردوں کے گوشت کی باس انہیں اپنی طرف کھینچتی ہے اور ادھر کا رخ کر جاتے ہیں۔ وہ کائیں کائیں نہیں کرتے کہتے ہیں۔ آدم بو۔ آدم بو۔ اب خدا معلوم کوے آدمی کا گوشت کھاتے بھی ہیں یا نہیں۔ البتہ ایسا ہی سنا تھا۔

شام کے بعد ہمارا جنگل میں جانا ممنوع تھا مگر ہمیں اپنی بلی کی فکر دامنگیر ہوتی۔ رات کا کچھ اعتبار نہ تھا۔ ہم شام ہوتے ہوتے ادھر نکل جاتے اور اسے کسی کپڑے میں لپیٹ کر لے آتے اور اپنے کمرے میں ایک طرف ڈال دیتے جہاں سے صبح کو اسے پھر جنگل لے جایا جاتا۔ ہم پھر اس کے کام سے لگ جاتے۔

ہماری جو بلی تھی ہمیں بہت عزیز تھی، ہم نے اسے بہت ناز و نعم سے پالا تھا۔ بلی پالنے کا خیال ہمیں اس وقت آیا تھا جب ہمارا کتا باؤلا ہو گیا تھا۔ کتے کی وفاداری میں کچھ شبہ نہیں۔ وہ بلیوں سے زیادہ مستعد ہوتا ہے۔ پھر وہ کارگر بھی بہت ہے۔ کتا دن میں تو بندھا رہتا۔ رات کو اسے کھول دیتے۔ وہ رات بھر بھونکتا رہتا۔ یہ حفاظت کا آسان ذریعہ تھا۔ وہ کتا اس بلی کی طرح ہم سے بہت مانوس تھا مگر پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ اچانک باؤلا ہو گیا اور بجائے پاؤں چاٹنے کے ایک دن اس نے گھر کے کسی فرد کی ٹانگ میں دانت گاڑ دیئے تب اسے جنگل میں لے جا کر گولی مار دی گئی۔ ہمارے گھر میں یہ خیال عام تھا کہ وہ اپنے پرائے کی پہچان بھول گیا تھا۔

اپنے پرائے کی پہچان بھولنے کی بات ہمارے گھر میں اکثر ہوتی رہتی تھی۔ جس سے تعلقات بگڑ جاتے اس کے بارے میں افسوس سے کہا جاتا کہ فلاں اپنے پرائے کی پہچان بھول گیا ہے مگر اس کے معانی کبھی سمجھ میں نہ آئے تھے۔ خیر سمجھ تو بعد میں بھی نہ آئے سوائے اس کے کہ اب یہ جملہ بولا جاتا تو بے اختیار وہ کتا یاد آجاتا جو باؤلا ہو گیا تھا۔

پالتو جانوروں سے تعلق رکھنے میں بھی عجب اک مزہ ہے۔ ایسے ہی کسی مزے کی

خواہش ہمیں پرندوں اور جانوروں کی طرف لے گئی۔ جب کتا نہ رہا تو ہم نے طوطا پالا مینا پالی۔ کبوتر سدھائے مگر بلی نے تو ہماری کایا ہی پلٹ دی۔ باقی شوق تو سب کے اپنے اپنے تھے۔ مگر بلی سب کا شوق تھا۔

وہ چھوٹا سا ننھا سا بچہ تھی جب ہم اسے کہیں سے لائے تھے مگر پھر سب نے لاڈ سے اس کے نخرے اٹھائے تو وہ پھول کر کپا ہو گئی۔ جب تن کر چلتی تو کسی چیتے یا شیر کا گمان ہوتا۔ مگر اس کی طرف سے کوئی خطرہ لاحق نہ تھا۔ جب گھر میں آتی تو مسکین بن جاتی۔ چھوئی موئی سی ہو جاتی۔

یوں تو وہ سارا دن گھر کے صحن میں یا کمروں میں ٹہلتی پھلتی رہتی مگر کبھی کبھی چھت پر یا منڈیر پر اترنے والے پرندے دیکھتی تو جیسے اس کے اندر کوئی برقی رو سی دوڑ جاتی - وہ جست کر کے ادھر نکل جاتی۔ اور پھر ان پر جھپٹنے کے لئے پھلانگتی پھرتی۔ گلی میں البتہ اس کا نکلنا ہمیں قبول نہ تھا۔ اس میں ہر طرح کے خطرے تھے۔ سوائے اس کے کہ کبھی کسی اپنے کے ساتھ اس کی حفاظت میں باہر چلی آتی ہو۔

وہ ہماری حفاظت میں تھی جب ہمارے ہمراہ گلی میں آئی تھی اس دن جس روز اس نے حافظہ کھویا۔ آئی اور پھر دفعتا" دوسرے کنارے کچھ دیکھ کر لپکی۔ بس اچانک کہ ہم روک نہ سکے۔ سڑک عبور کرنا چاہتی تھی کہ ایک تیز رفتار گاڑی نے اٹھا کر پٹخ دیا۔ ہم نے سمجھا کہ اجل اسے لے گئی۔ آخر ایک ننھی سی جان کو اور کتنا بڑا حادثہ درکار تھا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ ایسا ہوا کہ وہ گری سنبھلی اٹھی۔ اک پھریری سی لی اور چل پڑی۔ ہم حیران بھی ہوئے شرمسار بھی ہوئے - مگر وائے افسوس۔

وائے افسوس کہ وہ چل تو پڑی تھی مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے ہماری طرف رخ نہیں کیا تھا۔ گھر کے دروازے کی طرف نہیں آئی تھی۔ بلکہ دو قدم چل کر وہیں کسی کونے میں سمٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اسے کیا ہوا ہم حیران تھے۔؟

جب اٹھا کر اسے گھر لایا گیا تب احساس ہوا کہ ہمارا اطمینان بے سبب تھا۔ اس کی جان تو بچ گئی، مگر پہچان کھوئی گئی تھی۔ کہیں سر پہ چوٹ آئی تھی۔

اسے کیا ہوا؟ -- ہر کوئی پوچھتا تھا کہ اس کے تیور ہی بدل گئے تھے- یہ تو وہ بلی نہ تھی- وہ سارا دن منہ لٹکائے ایک طرف بیٹھی رہتی جیسے کچھ کھویا گیا ہو- نہ کسی کی طرف رخ کرتی- نہ دیکھتی- نہ اٹھ کر گود میں بیٹھتی- کسی کو نہ پہچانتی تھی- بس ایسا ہی عالم اس کا روز کا ہو گیا- چند دن تو گھر بھر نے اس کی اس حالت پہ افسوس کیا مگر پھر وہ توجہ سے باہر ہو گئی- سچ ہے وہ آدمی ہو یا جانور- اگر ویسا نہ رہے جیسا کہ وہ قبول ہوتا ہے توکون اس پر دھیان دیتا ہے- وہ بھی دھیان سے باہر ہو گئی سب اپنے اپنے کام سے لگ گئے-

سب اپنے اپنے کام سے لگ گئے تو پھر یہ ذمہ داری ایک ہماری رہ گئی- حالانکہ وہ پہچانتی تو ہمیں بھی نہیں تھی- "جب وہ تمہیں پہچانتی نہیں تو تم اس کے پیچھے کیوں مارے مارے پھرتے ہو- اسے اس کے حال پہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے--" سب سمجھاتے-

سب سمجھاتے مگر ہمیں یہ مخمصہ گھیرے رہتا کہ آخر اب وہ ہمیں کیوں نہیں پہچانتی- یا اس کی یادداشت کب واپس آئے گی- کیسے واپس آئے گی- یا پھر اس کی حیات اسی عالم میں ختم ہو جائے گی-

معلوم ہوا کہ اس کی یادداشت تب واپس آئے گی جب وہ چوہوں پر یا پرندوں پر جھپٹنا شروع کرے گی-

کیا ایسا وہ کرے گی--؟ جب ایک راستہ دکھائی دیا تو ہم اسے جنگل میں لے آئے اور درخت کی شاخوں میں گھرے ایک ٹنڈ منڈ درخت کی چوٹی پہ بٹھا دیا اور انتظار کرنے لگے اس دن کا جب ایسی کوئی گھڑی آئے گی-

ایسی گھڑی تو تب آتی جب وہ پرندوں کی طرف سر اٹھا کر دیکھتی- چھوٹے چھوٹے پرندے جو پہلے اس سے جھجکنے لگے تھے اب اس کی خود فراموشی دیکھ کر اس کے قریب بھی اتر آتے- چہکتے اور اڑ جاتے- وہ اس وقت بھی نہیں چونکتی تھی جب کوئی کوا پاس آکر بیٹھ جاتا تھا-

جب کوئی کوا اس کے پاس آکر بیٹھ جاتا تو ہمیں اک ذرا آس ہو جاتی- وہ اس طرح اس کی طرف دیکھتا تھا جیسے ابھی اس کے سر پر ٹھونگے گا اور وہ تلملا کر اس پر جھپٹے گی- ہم

اسے جھپٹتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر ایسا نہ ہوتا۔ وہ اس سے اٹھکیلیاں کر کے اڑ جاتا اور وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔

کوا بھی عجب پرندہ ہے۔ ہمہ وقت مستعد' چوکنا اور ہوشیار۔ سارے اطوار شکاریوں جیسے۔ اس کے اڑنے پھرنے میں کسی فراغت کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ وہ کھلے آسمان پر تیرنے پھرنے سے کوئی غرض نہیں رکھتا۔ ہمیشہ کام سے رہتا ہے۔ جب ایک شاخ سے دوسری شاخ جاتا ہے۔ جب کسی منڈیر پر اترتا ہے۔ یا کہیں پانی پینے رکتا ہے۔ بس ادھر ادھر گردن گھماتا رہتا ہے۔ اس کے ارد گرد یا تو کسی خطرے کی بو ہوتی ہے یا پھر کسی شکار کی۔ مگر شکار کیا کرتا ہے؟

بس اسی سے تو الجھن ہوتی کہ وہ شکار کیا کرتا ہے--؟ جب کسی صحن میں کوئی عورت آٹا گوندھتی ہو اور اپنے کسی خیال میں مگن ہو تو منڈیر پر آئے گا۔ اسے بے خبر پا کر اترے گا اور آٹے پر ٹھونگ کر چلا جائے گا۔ کسی درخت کی شاخ پر بیٹھے گا۔ بہت احتیاط سے ادھر ادھر دیکھے گا اور کوئی گری پڑی کھانے کی چیز اٹھا کر اڑ جائے گا۔ بس افسوس اس وقت ہوتا تھا جب کوئی کوا کسی چڑیا کے گھونسلے میں منہ ڈالتا اور اس کے انڈے یا بچے اٹھا لے جانے کی کوشش کرتا۔

جن پیڑوں پر چڑیوں کا فاختاؤں کا اور ابابیلوں کا ٹھکانا تھا کوے بھی انہی کی شاخوں میں بسیرا کرتے تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے پرندوں کو جب بھی بے خبر پاتے ان کے گھونسلوں میں منہ مارنے سے باز نہ آتے۔ ہمیں اسی لئے ان سے چڑ ہو گئی تھی۔ مگر اطمینان کی بات یہ تھی کہ ہم نے انہیں ہمیشہ ناکام ہی ہوتے دیکھا تھا۔

جب بھی کوئی کوا کسی پیڑ کی ان شاخوں کی طرف لپکتا جہاں کسی گھونسلے میں انڈے یا بے بال و پر کے بے بس بچے ہوتے تو اچانک شور پڑ جاتا۔ سارا جنگل گونج اٹھتا۔ پرندوں کو نہ جانے کیسے یہ خبر ہو جاتی کہ کہیں ان پر حملہ ہونے کو ہے۔ اسی شور اور ہنگامے سے کوا وحشت کھاتا اور وہاں سے اڑ جاتا۔ ہمیں چھوٹے چھوٹے پرندوں کی یہ دلیری بھانے لگی تھی۔

یہ بھی ایک طرح سے چوہے بلی کا ہی کھیل تھا جسے اب ہم روز دیکھنے لگے تھے۔ مگر ایک دن جو ہم نے دیکھا وہ ان منظروں سے مختلف تھا جو ہم دیکھتے آرہے تھے۔

ایک روز جو دیکھا تو ایک کوے کو اپنے شکار میں کامیاب ہوتے بھی دیکھا۔ شاید کوئی کوئی کامیاب ہو جاتا ہوگا۔ یا اکثر ہوتے ہوں گے۔ مگر ہمارے لئے اس طرح کا یہ پہلا منظر تھا۔ ایک کوے نے کسی گھونسلے تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ جہاں کسی پرندے کے انڈے تھے یا نوزائیدہ بچے تھے اور قریب کوئی نہ تھا۔ وہ انہیں اچکنے میں مصروف ہو گیا۔

وہ مصروف تھا اور ہم بے خبر تھے۔ ہمیں خبر اس وقت ہوئی جب اس پیڑ کے گرد چھوٹے چھوٹے پرندوں نے گھیرا ڈالا اور بولنے لگے۔ چلانے لگے۔ تب ہم نے اس کوے کو دیکھا جس کی چونچ میں کچھ دبا تھا۔ ہم جان گئے وہ کامیاب ہوا۔ اس کا ہمیں افسوس تھا۔

وہ کامیاب تو ہوا اور اڑا بھی ضرور مگر اس میں افسوس کی کیا بات تھی۔ ان چھوٹے پرندوں نے اسے یوں آزادی سے اڑنے نہ دیا تھا اور اس کے تعاقب میں ہو لئے تھے۔ اب وہ جدھر جاتا وہ پیچھے ہوتے۔ وہ جس درخت پہ بیٹھتا وہ بھی اس کی شاخوں پر ادھر ادھر پھیل کر بیٹھ جاتے۔ وہ پھر اڑتا وہ پھر پیچھے ہو لیتے۔ جانے کتنی دیر یہ کھیل جاری رہا۔ پھر وہ سب تھک گئے اور ایک پیڑ پر الگ الگ بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ چھوٹے چھوٹے پرندوں کے لئے اس سے آگے اور کچھ ممکن نہ تھا۔ سو سب ایک ایک کرکے اپنے معمول کی طرف لوٹنے لگے ہمیں افسوس ہوا۔ ہم کوے کے انجام کو اس سے آگے بھی دیکھنا چاہتے تھے۔

ہم اس سے آگے بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ سو جو دوسرے پرندوں سے نہ ہو سکا وہ ہم نے خود کرنے کی ٹھانی۔ کنکر پتھر اٹھائے اور اسے نشانہ کرنے لگے۔ چونکہ اس کا رخ ہماری طرف نہیں تھا اس لئے بے خبری اس کے لئے اجل لے کر آئی۔ ہم نے خوشی کے نعرے لگائے۔

اس دن یہ عجیب کام ہمارے سپرد ہوا۔ ہمیں کووں سے دشمنی درپیش ہوئی۔ وہ جو ہماری بلی تھی وہ تو خیر رفتہ رفتہ ہمیں فراموش ہوئی اور کوے درمیان میں آگئے۔ اب وہ صبح ہو یا شام ہم کنکر پتھر اٹھا کر انہیں نشانہ کرتے پھرتے۔ کوئی اڑ جاتا کوئی زد میں آجاتا۔ ہمارا

خیال تھا کہ اس طرح ہم چڑیوں، ابابیلوں اور فاختاؤں کے لئے ایک دن آسمان صاف کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

نادانی کی عمر تھی، بچپن کا زمانہ تھا۔ ہم پرندوں جانوروں اور آدمیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے۔ بس اسی طرح کے مشغلے تھے اور اسی طرح سوچا کرتے ۔

چڑیا گھر

پرندوں سے میری دوستی ختم ہوئی- کیسا قدیمی تعلق تھا یوں اچانک ٹوٹ جائے گا کبھی سوچا بھی نہ تھا-

پرندوں سے تعلق تو قدیمی تھا مگر باقاعدہ دوستی کا آغاز اس گھر میں منتقل ہونے کے بعد ہوا جس میں کہ ہم اب بھی رہتے ہیں- یہ گھر اس کالونی میں واقع ہے جہاں زیادہ تر سرکاری اہلکاروں کی رہائش ہے- علاقہ صاف ستھرا اور کشادہ ہے اور عام طور پر کسی مشکل کا سامنا نہیں-

اس گھر کی کھلی کھلی فضا نے کم از کم میری زندگی میں خاصا فرق ڈالا ہے- کمرے خوب روشن اور ہوا دار ہیں- باہر کی کشادگی نے ایک طرف سے آسمان کے کناروں کا منظر بھی کھول رکھا ہے- گردونواح میں سارا دن پرندوں کی ٹہل پہل دیکھی جا سکتی ہے- ان کے چہچہوں سے فضا بھری رہتی ہے-

جب ہم یہاں آئے تو ہمیں یہ موقع پہلی دفعہ ملا کہ کسی گھر کو اپنی مرضی کے مطابق بنائیں- میری بیوی کے اپنے شوق تھے وہ ان میں مگن ہوئی- میں نے البتہ یہ کیا کہ اپنے گھر کی چھوٹی سی کیاری میں خوشنما پھول لگائے- چنبیلی کی باڑ پھیلائی- ٹیرس پر ادھر ادھر پیالے لٹکائے جن میں دانہ دنکا ڈالا- اس انتظام نے گھر کو پرندوں کی آماجگاہ بنا دیا- ایک جلترنگ سی ہمہ وقت بجنے لگی-

میری بیوی کو یہ گلہ رہتا تھا کہ میرے دروازے کھڑکیاں کھلا رکھنے سے چڑیاں اندر آ گھستی تھیں- شور بھی مچاتی تھیں، گندگی بھی پھیلاتی تھیں- بچے الگ خوف زدہ ہو جاتے پھر ان پر پرندوں کو باہر نکالنا دشوار ہو جاتا- لیکن میں کیا کرتا میری تو ان سے دوستی تھی- ان کا

قرب و جوار میں ہونا مجھے اچھا لگتا تھا۔

پرندوں سے میرا تعلق اس وقت سے تھا جب گھروں میں صرف آدمی ہی نہیں رہتے تھے پرندے بھی رہتے تھے۔ چھتوں کا بوجھ لکڑی کے شہتیروں پر ہوتا تھا۔ اور چھتیں کیا تھیں مٹی میں بھوسہ ملا کر لیپ کر دیا جاتا۔ انہی لکڑی کے شہتیروں اور کڑیوں میں کہیں چڑیاں گھونسلہ بنا لیتیں اور پھر کھلے روزنوں سے آتی جاتیں۔ ایک ایسے ہی گھر میں میرا بھی بسیرا تھا۔

ایک ایسے ہی گھر میں چڑیاں بھی میرے ہمراہ رہتی تھیں جن کے چہکنے پر کمرہ خوب گونجا کرتا۔ وہ کیسے دن تھے جب خود چھت ہی آسمان تھا۔ جب چڑیاں منہ اندھیرے بولتیں اور اپنا آشیانہ چھوڑتیں تو یوں لگتا جیسے خود میں نے اپنے پنکھ کھول لئے ہوں، پھیلا لیے ہوں اور آسمان پر پرواز کے لئے نکل پڑا ہوں۔ ایسا بچپن سے تھا۔

پرندے ہمیشہ میرے لئے فراغت اور آزادی کا استعارہ رہے ہیں۔ بس اڑتے پھرنا، چہکتے پھرنا۔ مجھے بھی ایسی ہی حیات درکار تھی ہمیشہ کے لئے۔ گیت گاتی ہوئی اپنے آپ میں مگن۔ مگر ہمیشہ ایسا کب ممکن ہے۔

پرندوں کی چہکار اور پھولوں کی مہکار ہمیشہ کب کسی کے ہمسائے رہے ہیں۔ ٹھکانہ بدلتا ہے، موسم بدلتا ہے، ڈھنگ بدلتے ہیں، آدمی بدلتا ہے۔

جب آدمی بدلتا ہے تو اسے خبر کب ہوتی ہے۔ وہ ایک راستے سے دوسرے راستے پہ آتا ہے تو دوسری منزل کی طرف چل پڑتا ہے۔ یہ تو ہوا پہ ہے کہ وہ پتوں کو اڑا کر کس سمت لے جاتی ہے۔ زندگی کا چلن بھی ایک سا نہیں رہتا۔ نہ شوق ایک سے رہتے ہیں نہ مشغلے۔

وہ گھر کہ جہاں کبھی چڑیوں کے ساتھ میرا بسیرا رہا تھا۔ اس وقت کہیں پیچھے رہ گیا جب مجھے رزق کی تلاش کسی اجنبی شہر لے گئی اور کہیں ہجوم میں اتار دیا۔ وقت جو کبھی دبے پاؤں چلتا تھا اب بھاگنے لگا۔ شاید ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک دن آتا ہے جب آدمی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وقت کے پیچھے بھاگتا ہے اور اسے دم لینے کا موقع بھی نہیں ملتا۔

کبھی کسی تہوار پر کسی تقریب پر یا یونہی کسی چھٹی کے دن اسی گھر آنا ہوتا تو پھر یاد آتا کہ زمین کے علاوہ اک آسمان بھی ہے جسے میں بھولنے لگا ہوں۔ وہ آسمان کہ جس پر اندھیری شب میں ستارے چمکتے ہیں اور کوئی اشارہ کرتے ہیں۔ اور روشن صبحوں میں پرندے چہکتے ہیں اور کوئی پیغام دیتے ہیں۔ بس ایسی ہی کسی صبح مجھے چڑیاں آسمان پر لے جاتیں۔ میں بستر پر کروٹیں بدلتا اور ان کے گیت سنتا۔ باقی دن تو دنیا کے تھے۔

باقی دن تو ایسے تھے کہ زمین اور آسمان کے بیچ خود اپنی موجودگی کی خبر بھی نہیں ملتی تھی۔ دنیا کا مقدر سنوارتے رہو یا پھر اپنا۔ کچھ ایسا کرتے رہو کہ زندہ رہ سکو۔ زندہ رہنے کے لئے پھولوں اور تتلیوں اور پرندوں کا قرب و جوار میں ہونا لازم نہیں۔

تو پرندوں کا قرب و جوار میں وجود نہیں رہا تھا۔ بس آدمی تھے اور آدمیوں کا جنگل تھا اور اس جنگل میں زندہ رہنے کے لئے راستہ بنانا تھا۔

ہاں البتہ کسی کسی فرصت کے دن جب کہیں قریب ہی پرندوں کی چہکار سنائی دیتی تو اپنے ہونے کا احساس ہونے لگتا۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا۔

جب بہت دن گذر جاتے اور مجھے فرصت نہ ہوتی مگر بچے ضد کرتے کہیں کسی باغ میں جانے کی، کسی پارک میں یا کبھی چڑیا گھر۔ تو پرندوں کا چہکنا سنائی دیتا، پرندے کہیں قریب ہی اترتے اور بولتے۔ پھر کوئی بھولا ہوا وقت یاد آنے لگتا۔ کوئی گذرے ہوئے زمانے۔ کچھ پراسرار سا محسوس ہوتا۔ مگر زیادہ دیر کون سننے دیتا۔ بچوں کو تو اپنے سوالوں کے جواب درکار ہوتے ہیں۔ اور انہیں یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ پھول صرف پھول ہوتے ہیں۔ اور پرندے صرف پرندے۔ اور یہ اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کے ہونے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں صرف بدصورتی ہی نہیں حسن بھی ہے۔ انہیں تو سکھانا پڑتا ہے۔ پڑھانا پڑتا ہے۔ اور جب سیکھنے نکلو تو پھر پھول پھول نہیں رہتے۔ پرندے پرندے نہیں رہتے۔ اور آسمان --! وہ تو سرے سے ہوتا ہی نہیں۔

میں نے بچپن میں چڑیا گھر نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں دیکھتا تو میرے دماغ میں کیسے سوال آتے۔ میں کیا پوچھتا میرے بچے البتہ یہ پوچھا کرتے۔ "یہ جو پرندے ہیں۔ پرندے

کیوں ہیں"۔

میری بیوی کو موقع ملتا اور وہ انہیں پڑھانے بیٹھ جاتی "یہ پرندے اس لئے ہیں کہ یہ آدمی نہیں ہیں۔ یہ نا سمجھ ہیں۔ کم فہم ہیں اور آدمی اشرف المخلوقات ہے--"

"ایسا کیوں ہے کہ کچھ پرندے باہر آزاد اڑتے پھرتے ہیں اور کچھ پنجروں میں بند ہیں۔"

"ہمارے دیکھنے کے لئے اور تمہارے دیکھنے کے لئے-- جو آزاد ہیں انہیں تو ہم روز ہی ادھر ادھر دیکھتے ہیں۔ اور جو بند ہیں انہیں دور دور سے لایا گیا ہے۔"

"ان کے گھر کہیں دور ہیں---"

"بہت ہی دور----"

"یہ جو شیر ہے، چیتا ہے، بن مانس ہے، بھیڑیا ہے--- یہ سب جانور کیوں پنجروں میں بند ہیں---"

"اس لئے کہ یہ آدمی نہیں ہیں۔ وحشی درندے ہیں۔ حملہ کرسکتے ہیں اور ہلاک کرسکتے ہیں---"

"انہیں الگ الگ کیوں بند کیا گیا ہے۔ جنگل میں تو اکٹھے رہتے ہیں---"

"جنگل میں بھی یہ الگ الگ رہتے ہیں۔ بس وہاں پنجرہ نہیں ہوتا۔ اپنا اپنا ٹھکانہ ہوتا ہے-- انہیں اگر اکٹھا کر دیا جائے تو یہ تو ایک دوسرے کو کھا جائیں گے---"

"یہ ایک دوسرے کو کیوں کھا جائیں گے---"

"زندہ رہنے کے لئے ----"

زندہ رہنے کے لئے ایک دوسرے کو کھانا پڑتا ہے۔ دھکیلنا پڑتا ہے۔ پیچھے ہٹانا پڑتا ہے۔ ہم کچھ ایسی ہی باتیں بچوں کو بتاتے۔ سکھاتے۔ سمجھاتے اور انہیں اس مقابلے کے لئے تیار کرتے جو آگے چل کر انہیں درپیش تھا۔

میری بیوی کو ایک ایسا ہی گھر درکار تھا جہاں وہ اپنے بچوں کو زمانے کے مطابق زندہ رہنے کا سلیقہ سکھا سکے۔ ہمیں زندگی جہاں جہاں لئے پھری تھی وہاں ایسا ماحول نہیں تھا۔ اس

کے کچوکے دینے پر میں گذشتہ برسوں میں کسی ایسے ہی مقام اور کسی ایسے ہی گھر کے حصول میں لگا رہا تھا۔ مگر دھکیلنے اور پیچھے ہٹانے والوں نے کبھی اس کی نوبت ہی نہیں آنے دی تھی۔ سب طاقت کا کھیل تھا۔ اب قرعہ میرے نام نکلا تو ہمیں اپنے ڈھنگ کی زندگی ملی۔

یہ اپنے اپنے ڈھنگ کی زندگی اس گھر میں آکر کیسی خوبصورت ہو گئی تھی۔

میری بیوی نے مجھے یہ سہولت فراہم کی تھی کہ بچوں کی طرف سے بے فکر ہی رکھا تھا۔ یوں بھی وہ مجھے اس کام کا زیادہ اہل نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے فرصت ہوتی تو میں اپنے کام سے لگ جاتا۔ پودوں کے درمیان بیٹھتا' انہیں سینچتا۔ اور میرے گردونواح میں پرندے چہکتے۔ میں لکھنے بیٹھتا' سوچتا ہوتا تو ان کی چہکار جو میرے باہر بھی تھی اور اندر بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر میرے لئے لفظ لاتی معانی سے بھرے ہوئے لفظ-- میں نے خود کو ان سے اتنا مانوس کر لیا کہ وہ کبھی کبھار میرے کمرے تک بھی آجاتے۔ میرے لکھنے کی میز پر -- میرے کندھوں پر - میری کتابوں پر۔

بچے ان کے عادی نہیں ہو سکے تھے۔ وہ انہیں اپنے بہت قریب دیکھ کر ڈر جاتے اور شور مچانے لگتے۔ ان کے شور پر چڑیاں اڑ جاتیں۔ یہ کھیل عموماً" ہوتا۔ بس یہ ایک کھیل ہی تھا۔ شاید اگلے کسی موسم میں وہ مانوس ہو جاتے۔ مجھے یقین تھا۔

گرمیوں کا موسم گذر گیا۔ روشن اور چمکدار دن رخصت ہوئے۔ سردیوں کی خنک اداس شاموں نے گھیرا ڈالا۔ دروازے کھڑکیاں بند ہونے لگے۔ گلیاں جلد ویران ہونے لگیں۔ سناٹا بولنے لگا۔ بچے جلد ہی اونگھ جاتے۔ اور ہم سے چمٹ کر بے سدھ ہو جاتے۔ ہمیں کچھ دیر تک باتیں گھیرے رکھتیں۔ پھر کوئی فکر' کوئی خیال کوئی خواب لے اڑتا۔

یہ ایک ایسی ہی خاموش اور خنک رات تھی جب ہم باتیں کرتے کرتے چپ ہوئے تھے کہ میرے ساتھ چمٹا ہوا بچہ منمنایا "چڑیا--"-- اور پھر اور بھی مضبوطی سے اپنے بازو میرے گرد لپیٹ لئے۔ میرا تو دماغ پرندوں کی آوازوں سے بھرا رہتا تھا شاید! اب یہ آوازیں وراثت میں اسے بھی منتقل ہو گئی تھیں۔ میں نے یہی خیال کیا-- مگر وہ خواب میں کپکپایا کیوں تھا؟ اب تک تو ایسا نہیں ہوا تھا۔ یوں بھی اس گھر میں اب ہمیں بہت دن ہو گئے تھے---------

پھر ایسا ہوا کہ وہ عموماً" خواب میں کپکپانے لگا۔ چڑیا گویا اس کے لئے آسیب ہو گئی تھی۔ وہ سوتے میں جاگ اٹھتا اور صدا کرتا۔۔۔ "چڑیا"۔۔۔ پھر اسے بخار رہنے لگا۔ مجھے ندامت نے آگھیرا۔ میں نے انجانے میں کہیں وہ خواب اور خیال اس کے دل میں رکھ دیئے تھے جو کہ میرے تھے۔ مگر یہ وہم تو نہیں تھا۔ ایک شب میری بیوی بھی کسی لمحے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ "چڑیا ۔۔ چڑیا کہیں گھر میں بند رہ گئی ہے۔۔ وہ کہیں ہے۔۔"

ہم اس شب تلاش کرتے رہے۔ دالان دیکھا۔ بیٹھنے والا کمرہ۔ سونے والا کمرہ، پلنگوں کے نیچے، میزوں کے نیچے۔ ہمیں ڈھونڈتے رہنا پڑا کہ بھلا ایک ہی آشیانے میں چڑیاں اور آدمی اکٹھے کیسے رہ سکتے تھے۔ اب بچوں کا کمرہ دیکھنا چاہیئے **تھا** ۔ یہ خیال کیا۔

بچوں کا کمرہ بہت دنوں سے ان کے استعمال میں نہیں رہا تھا۔ جب سے دن چھوٹے ہوئے تھے انہوں نے اس میں جانا بند کر دیا تھا۔ وہاں اور کیا تھا۔۔؟ ان کے کھلونے تھے۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی استعمال کی چیزیں تھیں اور یہ اعتماد تھا کہ ایک گھر ان کا اپنا بھی ہے جو گھر کے اندر واقع ہے۔

وہ سکول سے واپس آتے تو ہوم ورک کرتے کرتے شام ہو چکی ہوتی۔ پھر وہ اونگھ جاتے۔۔ کھیل کی کس کو فرصت تھی۔ سو وہ بند تھا ۔۔۔۔۔اگر آج ہم نے کھولا تو ہمیں وہم کا سراغ مل گیا۔ چڑیوں نے کھلونوں والی الماری میں گھونسلہ ڈال رکھا تھا۔

۔۔۔ تو یوں اچانک چڑیوں سے دوستی ختم ہو گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ اگلے دن وہ پیالے توڑ دیئے گئے جو ٹیرس پر لٹکائے گئے تھے اور جن میں دانہ دنکا ڈالا جاتا تھا۔ کیاریوں کو جالیوں سے ڈھکا گیا۔ ایک درخت تھا وہ کاٹ دیا گیا۔ کھڑکیاں دروازے بند رہنے لگے اور چڑیوں کا وہ گھونسلہ جو ایک آسیب کی صورت کھلونوں والی الماری میں بنا پڑا تھا جمعدارنی کوڑا کرکٹ کے تھیلے میں ڈال کر لے گئی۔ اب گردونواح سے پرندوں کی آوازیں دور ہو گئی تھیں۔ وہم ختم ہو چکا تھا۔ بچے کا بخار اتر گیا۔ زندگی معمول پر آگئی۔ ہم نے اپنے اپنے آشیانے الگ کر لئے تھے۔ سو اب کسی شب گھر کے کسی کونے سے چڑیوں کی آواز نہیں آتی تھی۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ آتی تو تھی مگر میں کسے بتاتا۔۔۔۔؟

موت
آوارہ کُتّا

رات پھر سر پر آگئی تھی- ایک دن اور بیت گیا تھا- چلنا دشوار ہو رہا تھا- سانس پھولی ہوئی تھی- مگر خزاں زدہ شاخوں پر پرندوں کے گھونسلے اب بھی ہوا کی زد پر تھے اور گھروں میں واویلا مچا تھا- رک جانا محال تھا- کیسے ٹھہر جاتا' کیوں بیٹھ رہتا کہ گلیاں پھر اس کے انتظار میں تھیں-

یہ گلیاں ہمیشہ اس کے انتظار میں تھیں- صبح ہو یا شام- فقیر کے یہی معمولات تھے اور یہی منصب تھا- گلی گلی گھومنا' در در دستک دینا اور دعا کرنا- وہ ایک ذمہ داری نباہ رہا تھا- بس نباہے جا رہا تھا- دنیا کو دکھوں سے خالی کرنے کی خواہش اسے لئے لئے پھرتی تھی- زمانہ بیت گیا تھا- اب تھکن ہو جاتی تھی' بس تھکن سی ہو جاتی تھی- وہ کبھی کبھی خیال کرتا- وہی دن اچھے تھے- جب وہ دکھی دلوں کی پکار سن کر بھاگ پڑتا- خود دکھ بن جاتا- دھاڑیں مارنے لگتا- اس کے دعا کو اٹھے ہوئے ہاتھ آنسوؤں سے بھر جاتے- مگر یہ ابتدائی دنوں کا قصہ تھا- یہ ان دنوں کی بات تھی جب وہ کسی دکھ کے سرہانے بیٹھ رہتا تو پہروں بیٹھا رہتا- دعا کرتا- گڑگڑاتا- ضد پر اتر آتا- کبھی کبھی منوا بھی لیتا- مگر ان دنوں دل میں طاقت تھی جاں میں توانائی تھی- اب تو چلنا دشوار ہو رہا تھا- مگر چلنا پڑتا تھا یہ بھی نہ کرتا تو پھر کیا کرتا کہ دنیا ابھی تک بڑی مشکلوں میں تھی- ستارے اب بھی آسمان پر ٹوٹتے تھے اور بکھر جاتے تھے- دریا اب بھی راستہ بدل کر ہنستے بستے گھروں کو اجاڑ جاتے تھے- زمین اب بھی کروٹ لیتی تھی اور آباد شہروں کو الٹ جاتی تھی- درخت تنوں سے ٹوٹ جاتے جب طوفان اٹھتا' پرندوں کے گھونسلے اڑ جاتے جب ہوا چلتی جب بارش برستی' کچے کوٹھوں کو ڈھا جاتی- اب بھی جو دروازہ کھلتا تھا- دعاؤں کا طالب تھا- دکھ ختم کب ہوتے تھے بس آدمی بدل لیتے تھے- ایک دل سے

دوسرے دل میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اسے تعاقب کرنا پڑتا تھا۔ بھاگنا پڑتا تھا۔ اکثر وہ تھک جاتا۔ ہانپنے لگتا۔ مگر پھر اٹھ کھڑا ہوتا۔ اب بھی اسے کچھ کچھ یقین تھا کہ رفتہ رفتہ وہ دکھوں کو اپنی دعاؤں سے ایک ایک کر کے چن لے گا۔ وہ گھڑی آئے گی۔

تو اس گھڑی کی تلاش میں ایک اور رات سر پر آگئی تھی۔ ایک اور دن بیت گیا تھا۔ یہ جاڑے کی خنک اور اجاڑ رات تھی۔ گلیاں ویران پڑی تھیں۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ جہاں شام تک چہل پہل رہی تھی اب وہاں سناٹا تھا۔ درو دیوار بوچھاڑ کی لپیٹ میں آئے ہوئے تھے کہ طوفان باد و باراں تھا۔ اس نے ایک مرتبہ تو شکر ادا کیا کہ آج کی رات اگر دکھ کہیں تھے تو گھروں کے اندر بند تھے۔ گلیوں اور سڑکوں پر رسوا نہیں تھے۔ پھر بھی گھوم پھر کر دیکھنے اور تلاش کر لینے میں کیا حرج تھا۔ کوئی رال ٹپکاتا بچہ۔ کوئی رعشے کا مارا بوڑھا' کوئی دبکا ہوا خوفزدہ آدمی۔ کوئی بھوک اور ننگ کا مارا ہوا۔ کوئی بھی گلتا ہوا' سڑتا ہوا۔ ڈھلتا ہوا۔ وہ ایک گلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں داخل ہونے اور نکلنے کے عمل سے دو چار رہا۔ اس کے دونوں طرف مکانوں کی قطار تھی۔ ہوا کے زور پر جھولتے' دہرے ہوتے درخت تھے۔ کھلی ہوئی کھڑکیاں بج رہی تھیں' دروازے چرچرا رہے تھے۔ کانپتے' کپکپاتے گھروں پر بارش کی یلغار تھی' قدموں تلے پانی شور کرتا تھا۔ یہ اس کے مزاج کی بات تھی کہ اسے ہر چیز سر پٹختی ماتم کرتی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے دیکھتے دیکھتے بعض چیزیں ادھر ادھر ضرور ہوئی تھیں۔ کچھ مکان نئے بن گئے تھے کچھ اسی طرح پرانے تھے۔ مگر اس کے لئے کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ وہی شہر تھا' وہی لوگ تھے۔ وہ سمجھتا تھا جو نئے مکان ہیں ان میں نئے دکھ آباد ہیں' جو پرانے ہیں ان میں کہنہ سال غموں کا قیام ہے۔ یہ دنیا اس کے لئے ایسی ہی جگہ تھی۔ وہ چلتے چلتے ایک پل کو رکا۔ تمام شہر کے لئے نجات کی دعا کی۔ اب اس کی دعا آسان اور مختصر ہوا کرتی اور اس کا مفہوم بھی بدل گیا تھا۔ بس ویسی ہی روا روی کی دعا جیسی قبروں کے درمیان سے گذرتے ہوئے کی جاتی ہے۔ اور پھر واپسی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ مگر ابھی چند قدم چلا ہو گا کہ ایک کتے کی کراہٹ سن کر ٹھٹک جانا پڑا۔ کتا ایک دروازے سے ٹیک لگائے کسی بڑی اذیت میں مبتلا تھا۔ فقیر نے دیکھا کہ اس کی ایک پچھلی ٹانگ کچلی ہوئی

تھی اور وہ ناطاقتی سے بے حال تھا۔ وہ اس پر جھک آیا۔

کتا اس کے جھک آنے پر ہراساں ہوا۔ وہ اٹھتا اور گر پڑتا۔ اس کا ہیولا جھکتا اور ڈوب جاتا۔ اٹھتا اور ابھر آتا فقیر کو ایک لحظہ کے لئے اس کی بے بسی عجیب مضحکہ خیزی سی لگی اور وہ مسکرا پڑا۔ پھر نادم ہوا اور سر جھکا لیا۔ اسے ایسا نہیں چاہئے تھا۔

اپاہج کتے کا موت کے سوا چارہ کیا ہے فقیر نے خیال کیا۔ مگر اتمام حجت' اک دعا۔ دعا جو سب کے لئے ہے۔ کوئی جیسا ہے اور جہاں ہے۔ اس میں امتیاز نہیں۔ یہ اس کے لئے پھر امتحان کی گھڑی تھی - مگر جب سر آسمان کی طرف بلند کرنا چاہا تو ایک بوچھاڑ ایسی آئی کہ تلملا کر رہ گیا.............. جاتا کہاں' ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی سائباں نہیں تھا۔ البتہ وہ جس دروازے کے ساتھ کھڑا تھا اس کی درزوں سے روشنی باہر آتی تھی۔ لوگ ابھی تک جاگتے تھے۔ اس نے کچھ توقف کیا پھر دستک دے صدا کرنے لگا کہ اے دھن والو! اس کتے کو پناہ چاہئے۔ دروازہ کھولو' دعا دیتا ہوں۔

اندر کسی کمرے میں کوئی عورت درد دزہ میں مبتلا تھی اور گھر میں رونق کا سا سماں تھا کہ ایسے موقعوں پر اکثر ہو جایا کرتا ہے۔ نو عمر لڑکیاں کھلکھلاتی چہلیں کرتی پھرتی تھیں اور ڈومنی ڈھولک ٹھکورنے اور گیت گانے کی منتظر تھی۔

یہ عالم شام سے تھا۔ اور اب رات ڈھلی رہی تھی۔ تاحال مبارک سلامت کا شور نہیں اٹھا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا تھا۔ گھر والے کے چہرے پر اضطراب کے آثار نمایاں ہوتے جاتے تھے۔ کمرے کے بند دروازے کے پیچھے جب عورت کراہتی تو وہ بے چین ہو کر گھر کے برآمدے میں ہاتھ ملتا ٹہلنے لگتا۔ کھٹولے پر پڑی بڑھیا اس کی ماں البتہ پر سکون تھی اور مسلسل تسبیح پھیرنے میں مصروف تھی۔

"یہ وقت دعا ہے۔" دروازے پر دستک سن کر بڑھیا اٹھ بیٹھی۔

"ہاں اماں! یہ وقت دعا ہے۔" اضطراب کے مارے آدمی کو بھی اطمینان کی ایک راہ دکھائی دی۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھا اور دروازے کے پٹ وا کر دیئے۔

دروازے کھلتے ہی پہلے تو خزاں کی تند شور مچاتی ہوا کے ساتھ بارش کی بوچھاڑ آئی' پھر

فقیر داخل ہوا اور بعد میں کتا۔

کتا اپنی کچلی ہوئی ٹانگ گھسیٹتا، ہولے ہولے کرلاتا، ادھر ادھر تشویش سے سر گھما سونگھتا ایک کونے میں آ کر پڑ رہا۔ اس کے وجود میں ایک مسلسل لرزش ٹھہری ہوئی تھی اور وہ اپنے زخموں پر مسلسل روئے جا رہا تھا۔ فقیر کو معلوم تھا کہ اب وہ کوئی گھڑی کا مہمان ہے۔ مگر اتمام حجت ایک دعا۔ دعا اس کتے کے لئے جسے درد سے کسی پل نجات نہیں۔ اس نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ اضطراب کے مارے آدمی نے آگے بڑھ کر التجا کی. بابامیری عورت کے لئے بھی دعا کرو۔ فقیر نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوا کہ اس رونق والے گھر میں بھی کوئی تکلیف میں مبتلا ہے۔ اتنا معلوم ہونا کافی تھا۔ آگے اسے اپنی ذمہ داری پوری کرنا تھی۔ اس نے یہی سیکھا تھا کہ جاننے اور پوچھنے کی ضرورت کیا ہے کہ سارے دکھ ایک سے ہوتے ہیں اور سب دکھوں کی ایک ہی دعا ہے۔ نجات۔ یہ سوچا اور اس کی عورت کو بھی اپنی دعاؤں میں شامل کرلیا۔

یہ نجات کا لفظ بھی عجیب جادو لے کر اس پر منکشف ہوا تھا۔ کئی دفعہ اس نے اس لفظ نجات سے سارے دکھ سمیٹ لئے تھے۔ ایڑیاں رگڑتے سسکتے لوگ جب کسی پل چین نہ پاتے تو پھر وہ ان کے لئے نجات کی دعا مانگتا، جسم تو ٹوٹ گرنے اور پھر گلنے سڑنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں اور کوئی دعا کیا کام آئے گی۔ اب تو وہ ہنستے مسکراتے لوگوں کے لئے بھی نجات مانگتا تھا کہ اس نے اکثر دیکھا تھا کہ لوگ روتے روتے ہنس پڑتے تھے اور ہنستے ہنستے رو پڑتے تھے۔ کچھ اعتبار نہیں تھا۔

کیا اعتبار تھا کہ مردہ زندہ ہو جائے اور تنی ہوئی گردنوں والے توانا اور شاداں جسم بس دیکھتے ہی دیکھتے شہتیر کی طرح گر پڑیں یہ دنیا ایسی ہی جگہ تھی کچھ اعتبار نہیں تھا۔

"نجات اس کتے کے لئے، نجات اس عورت کے لئے۔ اور نجات نوعمر ہنستی مسکراتی چہلیں کرتی لڑکیوں کے لئے۔"

صحن کی چار دیواری میں خزاں کی ہوا کا شور کم نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی تھی خنکی بڑھتی جاتی تھی۔ اس نے اپنے کندھوں پر سے پیوند لگا بوسیدہ کمبل اتار کے

کتے کے لرزاں جسم پر ڈال دیا جو اب اپنی آخری سانسیں شمار کر رہا تھا۔ ٹانگ کے زخم پر گیلے اور کھردرے کمبل کی اچانک رگڑ سے وہ ایک مرتبہ تو منہ اٹھا کر بہت زور سے چلایا۔ پھر سر زمین پر رکھ دیا۔

کتے کی ہولناک آواز سن کر اندر نو عمر لڑکیوں میں کھلبلاہٹ مچ گئی۔ وہ ڈری ڈری سسکاریاں بھرتیں ادھر ادھر بکھرنے اور ایک دوسرے کو آگے پیچھے دھکیلنے کے شغل میں مبتلا ہوئیں اور شور کرنے لگیں۔ مرد جھنجلا گیا۔ پلٹ کر لڑکیوں کو ڈانٹا۔ وہ دبک گئیں۔ معمول میں فرق آگیا۔

فقیر کو ہمیشہ ایسے ہی سکون کی طلب رہی تھی۔ جس میں ہنسنا اور رونا دونوں نہ ہوں۔ ایک پر سکون خاموشی ہو۔ ایک ٹھنڈا سناٹا ہو۔ مگر ایسی خاموشی فی الحال نہیں ہوئی تھی۔ البتہ رونق میں کچھ کمی واقع ہوگئی تھی۔ وہ یکسوئی سے اپنا فرض ادا کر سکتا تھا۔

وہ اپنے فرض میں مصروف رہا۔ حتیٰ کہ ہوا کا شور ختم گیا۔ بس کوئی کوئی جھونکا آتا تھا۔ اس مختصر سے گھر میں قدرے خاموشی ہوئی تو اسے کتے کے لرزنے کی آواز کے ساتھ عورت کی کوئی کوئی کراہ بھی سنائی دینے لگی۔ یہ دونوں آوازیں بغیر کسی تسلسل کے اس تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کی سماعت جب متاثر ہوتی تو وہ بھول جاتا کہ کون سی آواز کتے کی ہے۔ اور کون سی عورت کی۔ مگر یہ کچھ دیر ہی ہوا۔ پھر اچانک کتے نے ہچکی لی اور لرزنا بھی ترک کر دیا۔ یکلخت ماحول میں کوئی چیز کم ہوگئی۔ اس نے اپنی لاٹھی سے اسے ٹھوکا دیا۔ مگر اس نے جھرجھری تک نہ لی۔ ہاں ایسا ہوناتھا۔ نجات تو ملنا تھی۔

اب بارش بھی ختم چکی تھی۔ چولہے میں لکڑیاں راکھ ہوچکی تھیں اور بڑھیا کا تسبیح والا ہاتھ ڈھلک گیا تھا۔ دردزہ کی کراہوں کے سوا ماحول پر غنودگی چھاچکی تھی۔ فقیر جھول رہا تھااور بڑبڑا رہاتھا پھر شاید اونگھ بھی گیایا بے حال ہوگیا۔

معلوم نہیں یہ رات کا کون سا پہر تھا۔ جب اچانک مکمل طور پر سناٹا چھا گیا۔ عورت نے کراہنا ترک کیا۔ یہ کسی ایک لمحے میں ہوا اور پھر اسی لمحے میں برقرار رہا۔ جیسے کائنات کا نظام رک گیاہو۔ گھر کا مرد جو اب اونگھ رہا تھا اس یکلخت کی خاموشی سے چونک گیا۔ اس کی

نیند کی ڈوری تو اپنی عورت کی کراہوں سے بندھی تھی۔ جو اب تھم چکی تھیں۔ کچھ ہو گیا تھا یا کچھ ہونے والا تھا۔

پھر اچانک اس لمحے کا فسوں ٹوٹ گیا اندر بند کمرے سے نوزائیدہ بچے کے بے طرح رونے کی آوازیں بلند ہوئیں اور چاروں طرف پھیل گئیں۔ اضطراب کا مارا آدمی سنسنا کر رہ گیا۔ پھر بھاگا ہوا ڈیوڑھی میں آیا۔ اور فقیر کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر خوشی سے پھولی ہوئی سانسوں میں گنگنایا۔ "بابا تمہاری دعائیں کام آگئی ہیں۔"

اب اسے معلوم ہو گیا تھا کہ کیا ہوا ہے

فقیر نے اس خوشی کی خبر کو خلاف توقع بڑے افسوس سے سنا تھا۔ اس کے دعا والے ہاتھ ڈھلک گئے تھے۔ اور اس نے بہت ملول ہو کر سر جھکا لیا تھا۔

اندر مبارک سلامت کا شور بلند ہو چکا تھا۔ نوعمر لڑکیاں جاگ چکی تھیں۔دایہ کے چہرے پر طمانیت تھی اور بڑھیا پر سکون تھی۔ مرد شرمایا سا بہت سرشار پھر رہا تھا اور ڈومنی ڈھولک کی رسیاں کسنے میں مصروف ہو چکی تھی۔ نومولود کے رونے کی آواز نے گھر کو خوشیوں سے بھر دیا تھا۔

فقیر کے حواس ذرا بحال ہوئے تو اس نے کھینچ کر اپنا کمبل کتے کے مردہ جسم سے جدا کیا۔ کاندھے پر رکھا اور باہر گلی میں آگیا۔ باہر ہر سو رات کے پچھلے پہر کی سنسناتی ہوا کے ساتھ اڑتی پھرتی تھی۔ وہ ایک گلی سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں داخل ہونے اور نکلنے کے عمل میں مبتلا ہو گیا۔ ہر دروازے کے سامنے رکتا۔ تاسف کرتا اور چل دیتا نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز مسلسل اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ اس سے بچ کر کہاں جاتا۔ بہت دیر تک مارا مارا پھرتا رہا۔ پھر تھک ہار کر ایک کونے میں بیٹھ رہا۔ اور اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

"ایک دکھ ختم ہوتا ہے ایک پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا تیری دعاؤں کے اختیار سے باہر ہے۔"

گُلّے کی
آوارہ موت

زمین پر آدمی اور کتے ایک ساتھ رہتے تھے۔ کہیں کہیں گھروں کے اندر ایک ساتھ اور کہیں کہیں گلیوں میں ایک ساتھ......... کبھی کبھی آوارہ اور کبھی کبھی یک جا.............

جن کتوں کے گلے میں پٹہ ہوتا انہیں ان کے ٹھکانوں پر رزق دستیاب ہوتا مگر جنہیں کوئی زنجیر میسر نہ ہوتی انہیں تلاش کرنا پڑتا...... وہ ادھر ادھر منہ مارتے...... کبھی کبھی آدمی اور کتے ایک ساتھ بھی منہ مارتے کسی کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر...... ہمارے گھر کے بالمقابل.....

ہمارے گھر کے بالمقال علاقے بھر کے لوگ گھروں کا کچرا لاکر ڈھیر کر دیا کرتے۔ جس پر مکھیاں بھنبھناتیں، مچھر افزائش پاتے اور بدبو رقص کرتی اور رقص کرتے بھکاریوں کے وہ بچے جنہیں ادھ کھائے پھل، باسی روٹی کے ٹکڑے اور کوئی بے کار مگر انوکھی سی چیز دستیاب ہو جاتی............یوں بس اچانک............

میں کھڑکی سے دیکھتا اور میری بیوی دروازے سے اوٹ بنا کر..................

دور تک ویرانے میں کوئی کوئی گھر تھا۔ کوئی کوئی مکمل اور کوئی کوئی نامکمل......... اور کسی کسی گھر کی منڈیر پر کوئی کوئی آدمی اور کوئی کوئی پرندہ............. باقی سب سنسانی تھی......... اب وہ سنسانی یاد آتی ہے...........

اب وہ سنسانی یاد آتی ہے، پہلے کاٹنے کو دوڑتی تھی.... جب کاٹنے کو دوڑتی تو کتوں اور بھکاریوں کا انتظار رہتا....

کتوں کا انتظار رات کو ہوتا تھا.... دن میں وہ بھلے نہیں لگتے تھے....... رات اس ویرانے میں ان کے بھونکنے اور بھونکتے ہی رہنے کے باعث ہی تو محفوظ تھی... مگر بھکاری ؟

..... بھکاریوں کی رات کو حاجت نہیں تھی۔ رات تو ان کی صدا پر بھیانک ہو جاتی اور چوری چکاری کا اندیشہ جاگ اٹھتا.... ہاں البتہ دن.... دن میں تو وہ غنیمت تھے۔

دن میں وہ غنیمت تھے کہ میری بیوی انہیں باسی روٹی کے ٹکڑوں کے عوض اپنے دالان میں بٹھا کر ان کے بیتے ہوئے دن سنتی اور دل بہلا لیتی.... اکثر بھکاری اس علاقہ کے قدیمی مکین ہونے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ اپنے اپنے دنوں کا ہمہ وقت تذکرہ کرتے اور اس انہونی پر جو وقت نے بپا کی تھی کف افسوس ملتے۔ دروازے پر خوب رونق رہتی۔

شہر سے باہر کا یہ علاقہ جو اب ہرگز سنسان نہیں ہے کہتے ہیں کبھی یہاں کھیت اور کھلیان تھے گاؤں اور دیہات تھے۔ چوپال تھی.... لہلاتی فصلیں.... ہرے بھرے درخت... چہچہاتے پرندے........ ہر طرح کی زندگی..... ہر طرح کا آدمی.... ہر طرح کا جانور....... اور ہر طرح کے کتے........

کسی ایک زمین پر رہنے بسنے والے چلنے پھرنے والے ضروری نہیں کہ اس زمین کا حق ملکیت بھی رکھتے ہوں۔ یہی یہاں بھی تھا۔ جب یہ دیہات رہائشی مقاصد کے لئے فروخت ہوئے تو کھیتوں اور پیڑوں کو تو کٹنا ہی تھا اور ہر طرح کے گھروندوں کو مسمار ہونا تھا۔ سو ایسا ہوا... ممکن ہے لوگوں کو معاوضہ بھی ادا کیا گیا ہو؟ .... یقیناً کیا گیا ہو گا............ سوائے ان کے جو حق ملکیت نہیں رکھتے ہوں گے....

.... رواج تو یہ تھا کہ جو حق ملکیت نہ رکھتے ہوں وہ زمین کے ساتھ ہی فروخت ہو جائیں یہی صدیوں سے ہوتا آیا تھا مگر اب اور بات تھی۔ اب یہاں جدید طرز کی بستی تعمیر ہونا تھی۔ ایک اور طرح کا رواج بننا تھا۔ سو' وہ مخلوق زمین کے ساتھ فروخت نہیں ہوئی۔ اب وہ اس زمین کے باسی نہیں تھے۔ نہیں تھے لیکن پھر بھی دعویٰ رکھتے تھے۔

ہمیں ان کے دعوے سے کام نہیں تھا۔۔ ہمیں تو ذرا ان کی موجودگی کی تھوڑی سی حاجت تھی کہ اس ویرانے میں تنہائی کا کوئی تو چارہ ہوتا۔۔۔

ہماری تنہائی کا کچھ چارہ کرنے والے یہ قدیمی مکین ادھر ادھر عارضی سی جھونپڑیاں بنائے اب تک پڑے تھے۔ وہ جس زمین پر پڑے تھے وہ فروخت ہو چکی تھی اور اس پر اپنے اپنے

نئے گھر تعمیر کرنے والے رفتہ رفتہ سامنے آرہے تھے۔ یہ عذاب جاری تھا۔..... یہ عذاب جاری تھا کہ ایک اور نازل ہوا۔...

اکا دکا آباد گھروں میں سے کسی کے ہاں چوری کی واردات ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان قدیمی مکینوں کا شیرازہ بکھیر دیا گیا جو بے خبری کی لذت میں گم تھے۔ اس ایک واقعے نے کایا ہی پلٹ دی --- وہ جھونپڑیاں مسمار کر دی گئیں جہاں وہ رہتے تھے دیگر ہر طرح کا بھکاری بھی زیر عتاب آیا .... کچھ پکڑے گئے' کچھ کوچ کر گئے ...... ویرانی ہو گئی۔

یہ ایکا ایکی کیا ہو گیا تھا........ دن بھر سنسان رہنے لگا.......... سوائے ان زیر تعمیر مکانوں کے جہاں مستریوں مزدوروں کا کبھی کبھی شور اٹھتا تھا' یا ان اکا دکا آباد گھروں کے کبھی کبھی کھلتے بند ہوتے دروازوں کے اور باقی کوئی آواز نہیں تھی.......... ہمارے دروازے پر اب کوئی قدیمی مکین نہیں آتا تھا-- نہ کوئی اور طرح کا بھکاری --- کوئی ایسا جو آکر بیٹھ رہے۔ میری بیوی سارا دن دروازے پر اوٹ بنائے کھڑی رہتی اور شام تک یہ افسوس کرتی پلٹ آتی-- کہ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟

.... ہر ایک کو اور طرح کی زندگی درکار ہوتی ہے .... میں ہمیشہ سکون کا طالب رہا ہوں اور میری بیوی نے ہمیشہ ہنگامہ پسند کیا ہے...... یہ کچھ ضرورت کی بات بھی تھی۔ اس علاقے میں آنے کے بعد اسے انسانوں سے دلچسپی پیدا ہوئی اور مجھے کتوں سے کہ ویرانہ تھا۔ وہ جو دن میں کوئی نہ کوئی بھکاری ادھر آنکلتا تھا اس سے اس کے لئے رونق ہو جاتی تھی۔ - اب وہ رونق نہیں رہی تھی۔ اس کا دن ویران تھا۔ لیکن عام طور پر یہ اس کی پریشانی تھی میرا مسئلہ اور تھا کہ کتے ختم نہ ہوئے تھے۔ میری رات آباد تھی۔ -

رات کو کتے بھونکتے رہتے تو میں اطمینان سے سویا رہتا کہ اس ویرانے میں اس سے بہتر چوکیدار اور کوئی ممکن نہ تھا۔ - - کچرے کا وہ ڈھیر جو ہمارے گھر کے بالمقابل تھا اس کی بدبو مجھے اسی لیے گوارا ہوئی تھی کہ رات وہاں کتے پڑاؤ کرتے تھے۔.. وہ کھانے پینے کی باس پاکر آتے۔ چپڑ چپڑ منہ چلاتے۔.... دن تو ان کا وہاں آنے جانے میں گزرتا تھا مگر رات یہیں مستقل ٹھکانہ تھا۔.... ذرا سی کہیں چاپ ہوتی اور وہ بھونکنے لگتے.............

یہ کتے بھی یہاں کے قدیمی مکین تھے۔ خیال ہے کہ وہ ماضی میں سب کھیتوں اور کھلیانوں کی رکھوالی کے کام آتے رہے ہوں گے یا ہو سکتا ہے جنگل اور ویرانے سے راتوں کو یہاں آ آ کر گاؤں کے گرد و نواح میں اپنا رزق تلاش کرتے رہے ہوں گے۔ بہر حال کتے تھے اور بے حساب تھے۔ یہی درکار تھا۔.... غنیمت تھا کہ اس ویرانے میں میرے گرد و نواح سے آدمی کم ہوئے تھے کتے نہیں۔ مگر اب کتوں کی باری تھی۔

وہ آدمی ہوں یا کتے ۔... اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ تکلیف دینے لگیں تو ختم کر دیئے جاتے ہیں۔ اس میں امتیاز نہیں۔

.... ہوا یہ کہ ایک دن ایک آوارہ نے کسی کو اچانک کاٹ لیا۔ آدمی بار سوخ تھا۔..... خوب ہاہا کار مچی........ اخباروں میں بھی لکھا جانے لگا.... یہ اسی ہنگامے کا سبب تھا کہ کتوں کی شامت بھی آہی گئی اور وہ بھی ایسے کہ بلدیہ والوں کے کتے مار حرکت میں آئے اور پورا علاقہ میدان جنگ بن گیا۔ صبح ہوتی اور معلوم نہیں کہاں کہاں سے آکر ایک ہجوم تماشہ کرنے کو اکٹھا ہو جاتا...... جو کتوں کو ادھر ادھر بدحواسی میں بھاگتے اور کتے ماروں کو انہیں اپنا نشانہ بناتے دیکھتا........ وہ ہلاک کئے جاتے.... اور گھسیٹ کر دور ویرانوں کی نذر کر دیئے جاتے....

کتوں کے قلع قمع کرنے کا ایک حربہ اور بھی استعمال ہوا کہ لگے ہاتھوں کو ڑا کرکٹ کا وہ ڈھیر بھی وہاں سے ہٹا دیا گیا جو ہمارے گھر کے سامنے تھا اور جہاں رات کو کتے قیام کیا کرتے تھے۔ اب ذرا ہٹ کر مناسب جگہوں پر کوڑا کرکٹ کے ڈرم رکھوا دیئے گئے جو ہر شام کوڑا اٹھانے والی گاڑی صاف کر جاتی..... بیٹھے بٹھائے اک عالم اور ہوگیا۔ اب میری اور میری بیوی کی پریشانی ایک سی تھی.... آدمی بھی کم ہو گئے اور کتے بھی....

کتوں کے اٹھ جانے سے بالکل سناٹا ہوگیا۔ دن کا کیا تھا وہ تو بھاگ دوڑ میں گذر جاتا تھا' رات گزارنی مشکل ہوگئی.... ہر وقت خطرہ لگا رہتا' ذرا سی آہٹ ہوتی اور دل بیٹھنے لگتا...

...... ہر چند کہ کتے ختم نہیں ہوئے تھے' کم ہوئے تھے۔ ختم کیسے ہو سکتے ہیں' البتہ اب وہ غول در غول نہیں رہے تھے اور جو دو چار ادھر ادھر منہ مارتے پھرتے تھے ان کا وہ

طنطنہ نہیں رہا تھا...... آدمی کی صورت دیکھ کر خوف کھاتے۔ ذرا پرے سے ہو کر نکل جاتے۔.... یا پھر غلاظت کے ان ڈرموں کے گرد منڈلاتے پھرتے جو بہرحال ہمارے گھر سے قدرے فاصلے پر تھے۔ ہاں البتہ یہ اکا دکا کتے ایک مرتبہ تو ادھر سے اب بھی گزرتے تھے آخر ہمارے گھر کے سامنے ان کا مستقل ٹھکانہ رہا تھا' مگر رکتے نہیں تھے۔ بس اک ذرا زمین کو سونگھا اور نکل لیے۔ اب وہاں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان بھی تو نہیں رہا تھا۔

ہمیں دھیان نہیں رہا تھا ایک لاغر سا کتا بہرحال ایسا بھی تھا جو اب بھی رات کو اس کچرے کے ڈھیر والی جگہ پر مستقل قیام کرتا تھا بلکہ دن کو بھی ٹہلتا پھرتا۔ شاید اس لیے کہ کسی ایک کو تو وفاداری نبھانا ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کی طرح کہیں اور نہیں گیا بلکہ وہیں پڑا رہ گیا۔ لیکن چونکہ وہ بھونکتا نہیں تھا اس لیے دیر تک ہماری توجہ میں نہیں آیا...... جب توجہ میں آیا تو قدرے اطمینان ہوا.... کتوں کے وہاں سے اٹھ جانے پر مجھے اپنا گھر چھتوں اور چاردیواری کے بغیر ایک خالی میدان سا محسوس ہونے لگا تھا.... اس لاغر سے کتے نے ویرانے کو قدرے آباد کر دیا..... وہ بھونکتا نہیں تھا کبھی کبھی محض کرلاتا تھا۔

ہم نے اس کی کوئی ایسی زیادہ نازبرداری نہیں کی۔ ہاں محض اپنی غرض سے کوئی کھانے پینے کی چیز اس کے آگے پھینکی ہو تو پھینکی ہو تاکہ وہ وہاں پڑا رہے...... لیکن چونکہ وہ عین ہمارے گھر کے سامنے پڑاؤ رکھتا تھا شاید اسی سبب سے اس نے ہمیں شناسا جانا اور مسئلہ بن گیا۔

ایک شام ہمارے گھر ہنگامہ بپا ہو گیا۔ بچے شور مچانے لگے ''امی امی کتا....'' وہ دروازہ کھلا دیکھ کر گھس آیا تھا اور ایک چارپائی کے نیچے پایا گیا تھا۔ پھر پورچ میں گاڑی کے نیچے.... پھر دالان میں' پھر کچن میں' یہ روز کا قصہ تھا' ایک نئی صورتحال تھی۔

وہ آوارہ کتے جو گھروں کی ڈیوڑھیوں میں کان لٹکائے' دم گرائے گھس آتے ہیں وہ اکثر بے ضرر ہوتے ہیں۔۔ کسی ٹھٹھرتی شام میں پناہ کی خاطر یا بھوک میں کسی چیز کی بو پا کر صرف بچھڑے ہوئے یہ راہ اختیار کرتے ہیں اور دھتکارنے پر دم دبا کر سر جھکا کر نکل لیتے ہیں۔ ان سے کیا خطرہ۔ مگر مجھے کتوں سے محبت بھی نہیں تھی۔

مجھے کتوں سے محبت نہیں ہے۔ میں نے تو بلکہ عام طور پر ان سے نفرت کرنا سیکھا ہے۔ یہ کراہت انگیز مخلوق مجھے ہمیشہ اپنی ٹانگوں سے لپٹتی اور بھنبھوڑتی محسوس ہوئی ہے۔ یہ تو ضرورت کا مسئلہ تھا مگر وہ مریل سا کتا اکثر گھر میں گھس آنے لگا تھا جبکہ ہمیں وہ باہر درکار تھا رات کو بھونکتا ہوا.....

وہ گھس آنے لگا تھا اور میرے معمولات میں یہ بات شامل ہو گئی تھی کہ میں شام کے بعد دروازوں کی کنڈیاں چڑھانے سے پہلے گھر کے ہر کونے کھدرے کو اچھی طرح سے دیکھ لوں۔ چارپائیوں اور کرسیوں کے نیچے جھانک لوں، کہیں وہ کسی جگہ دبکا نہ بیٹھا ہو۔ اس کتے نے ہمیں ایک نئے مسئلے سے دوچار کر دیا تھا۔ یہ ایک نئی فکر مندی تھا۔ خیر! مگر جلد ہی صورتحال میں ایک اور تبدیلی بھی آئی، جس سے پہلے تو اس فکر مندی میں اضافہ ہوا لیکن پھر حالات معمول پر آ گئے۔

........ہوا یہ کہ وہ ہمارے گھر کے سامنے والا خالی قطعہ زمین کہ جہاں کبھی کچرے کا ڈھیر ہوا کرتا تھا اور جہاں اب وہ لاغر سا کتا قیام رکھتا تھا' اس کے مالکان نمودار ہوئے اور مکان کی تعمیر کا عمل شروع ہو گیا۔

ہم یہی چاہتے تھے۔ اس علاقے کی تعمیر ہی سے اس ویرانی سے چھٹکارا ممکن تھا جس میں کہ ہم گھر گئے تھے، مگر اس سامنے والے مکان کی تعمیر سے اس لاغر کتے کے لیے حالات قدرے مشکل ہو گئے تھے۔ اب وہاں کوئی خالی میدان نہیں تھا جہاں وہ رات بسر کر سکتا......

دن میں بھی وہ مزدوروں اور مستریوں کی زد پہ رہتا البتہ صبح جب ہم جاگتے تو وہ ہمیں اپنے دروازے پر بیٹھا ملتا۔ اب شاید وہ رات یہیں بسر کرتا تھا۔ اس میں کچھ مضائقہ نہیں تھا مگر ہم اس کے آگے کوئی کھانے پینے کی چیز پھینکنے سے اس لیے گریز کرتے تھے تاکہ وہ ہمارا گرویدہ ہو کر پھر سے کمروں اور دالانوں میں نہ گھسنے لگے۔

اس کتے سے مجھے رغبت تو نہیں تھی مگر میں نے یہ ضرور چاہا تھا کہ رات بھر وہ سامنے کہیں پڑا رہے۔ اب جبکہ سامنے دن اور رات ہر پہر کوئی نہ کوئی آدمی موجود ہوتا تھا۔ گردو نواح میں گھر تعمیر ہونے لگے تھے لہٰذا اس کی ضرورت کم ہو گئی تھی اس لیے نظرانداز ہونے

لگا تھا۔ عین دروازے پر اس کی موجودگی اب ہمارے اندر آنے جانے میں حارج ہونے لگی تھی اس لیے دھتکارنے کے سوا چارہ کیا تھا۔ وہ بھی جن نئی مشکلوں میں گھر گیا تھا اس کے سبب سے اسے کہیں کوچ کر جانا ہی مناسب تھا' پھر ایسا ہی ہوا۔ نظر انداز تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا پھر انکشاف ہوا کہ وہ نہیں ہے' بلکہ پچھلے کئی دنوں سے نہیں ہے۔ وہ واقعی کسی اور طرف نکل گیا تھا۔

اس ویرانے میں آکر آدمیوں سے میرا تعلق کم اور کتوں سے زیادہ ہو گیا تھا جو اب آکر انجام کو پہنچا۔ مجھے یاد ہے کہ جب کچرے کے ڈھیر پر رات کے کسی پہر کتے غول در غول اکٹھے ہوتے تو مجھے کتنی طمانیت ہوتی۔ اور مجھے یاد ہے کہ جب کتوں کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی گئی اور سامنے سے کچرے کا ڈھیر ہٹایا گیا تو مجھے کتنا افسوس ہوا اور وہ لاغر سا کتا' جو اک ذرا سا سہارا تھا.... اب ہنسی آتی ہے۔

اب ہنسی آتی ہے کہ کیسے ہم نے اسے اپنا مانوس کیا اور کیسے پھر وہ گھر کے فرد کی طرح چپکے سے اندر گھر میں پایا جانے لگا.... صد شکر کہ اب وہ نہیں تھا' کہیں اور چلا گیا تھا..... دن بیت گئے پھر ہم نے باور کیا کہ کہیں مر کھپ گیا ہو گا۔

......تو جب ہم اسے بھول گئے اور جب ہم نے باور کیا کہ وہ کہیں مر کھپ گیا ہو گا۔ عین انہیں دنوں پھر ایک شام کہ جب میں اوپر اپنے کمرے میں کسی کام سے مصروف تھا نیچے بچوں کا شور پڑ گیا۔ "امی امی کتا آیا ہے۔۔" میں نے جب یہ شور سنا تو گھبرا کر اٹھا اور لاٹھی لے دروازے کی طرف بھاگا...... کیا وہ کتا لوٹ آیا تھا اور اب اندر گھسا بیٹھا تھا' مگر دروازے کی کنڈی تو اندر سے بند تھی میں نے دیکھا۔

کنڈی بند تھی مگر کوئی دروازے پر بار بار دستک کر کے مسلسل صدا کر رہا تھا....... "گھر والو تمہارے دروازے پر کتا کھڑا ہے اس کے آگے کچھ ڈالو....." کتا بول کیسے سکتا تھا میں نے کنڈی کھول دی۔ سامنے کوئی کتا نہیں تھا ایک بوڑھا آدمی تھا جو خود کو بڑی شد و مد سے کہہ رہا تھا۔ حیرت تھی۔

فقیر اور بھکاری اپنی ہستی کو گرا کے' بلبلا کے بھیک طلب کرتے ہیں' اس میں کچھ بھی

انوکھا نہیں..... اس نے بھی شاید ایسا ہی کیا تھا' سو یہ حیرت کی بات نہ تھی- حیرت کی بات یہ تھی کہ ہم نے اپنے دروازے پر اب تو ایک طویل عرصے بعد ایک بھکاری دیکھا تھا- یہ میری بیوی کی طمانیت کا سامان تھا-

......ہر چند کہ ادھر ادھر مزدور لوگوں کی موجودگی سے ویرانے میں آبادی کے آثار پیدا ہوئے تھے مگر اڑوس پڑوس میں گھرداری کا عمل شروع نہیں ہوا تھا سو میری بیوی کی تنہائی اسی طرح برقرار تھی بلکہ پہلے سے بڑھی ہوئی تھی- وہ جو کبھی کبھار چھت پر چڑھ کر یا دروازے کی اوٹ سے باہر پرندوں کو اڑتا پھرتا دیکھ لیا کرتی تھی گرد و نواح میں مزدوروں اور مستریوں کے کام پر آجانے کے سبب یہ بھی جاتا رہا تھا- اب باہر جھانکنے میں کوئی جھجک مانع تھی- اس نے اسے چڑچڑا بنایا تھا- جب دن گزار کر شام آتی تو وہ اکثر بلبلا کر کہتی....." یہ بھی کوئی زندگی ہے- اب تو وہ اللہ مارا کتا بھی ادھر نہیں آتا....." یہی سبب تھا کہ اس بھکاری کی آواز نے اسے شادمانی سے بھر دیا- تو اس نے اسے نہ صرف اس وقت کھانے کے لیے دیا بلکہ اگلے روز آنے کا وعدہ بھی لیا.....

یہ اس وعدے کا اثر تھا یا کیا تھا وہ بھکاری ہر شام آنے لگا- ہر چند کہ وہ پہلے کبھی دکھائی نہیں دیا تھا مگر اسے بھی یہاں کا قدیمی مکین ہونے کا دعوی تھا.......... اس کے پاس بھی کچھ کہانیاں تھیں ...... وہ آتا اور صدا کرتا .... "گھر والو .... تمہارے در پر یہ کتا کھڑا ہے ...." میری بیوی ہر کام چھوڑ بھاگی چلی آتی- کنڈی کھولتی اور اس کے کھانے کا بندوبست کرنے بیٹھ جاتی' پھر محفل لگتی-

وہ دن میں نہیں آتا تھا- شام کے بعد آتا.... اور میری بیوی سہ پہر ہی سے اس کا انتظار کرنے لگتی اور پریشان ہو کر بڑبڑاتی رہتی- اللہ جانے آج کتا کیوں نہیں آیا-

یہ غلیظ سا لفظ کتا اس کا نام نہیں تھا- مگر وہ اسی نام سے ہمارے گھر مقبول ہوا..... ہم کیا کرتے اس کا کوئی نام ہی نہیں تھا- اگر تھا تو اس نے بتایا نہیں.... "در بدر پھرتے کتوں کے بھی کوئی نام ہوئے ہیں-" ایک مرتبہ اس نے ہنس کر کہا تھا اور اگر ہم نے پوچھا تم رہتے کہاں ہو جواب تھا "آوارہ کتوں کا کیا ٹھکانہ.... بس بھاگا پھرتا ہوں...." ..... وہ اسی

طرح بات کرتا تھا۔ جب بھی کوئی گذرے ہوئے وقتوں کی کہانی بیان کرتا اسی طرح آغاز کرتا۔ "ہم اس علاقے کے کتے تھے...."

وہ کہ جسے ہم کتا کہنے لگے تھے اپنی شکل و شباہت، آواز یا چال ڈھال کے لحاظ سے بھی کتا تو کیا کسی بھی جانور سے مشابہہ نہیں تھا۔ انسان کی صورت تھا۔ بڑھاپے سے البتہ کمر جھک آئی تھی۔ بال بڑھے ہوئے تھے اور لٹیں کندھوں پر جھولتی رہتی تھیں۔ میلا کچیلا ضرور تھا۔ مگر اس میں کسی ذلالت یا بے سلیقگی کا کوئی دخل نہ تھا۔ ایسا صرف مفلوک الحالی اور بے پروائی کے باعث تھا، آخر گداگر تھا اس سے زیادہ بہتر حالت میں اور کیا ہوتا۔

شروع شروع میں مجھے اس کتے کی (کہ جو اصل میں آدمی تھا) آمد غنیمت لگی تھی وہ میری بیوی کی تنہائی کا سہارا تھا۔ مگر رفتہ رفتہ محسوس ہوا کہ جیسے میں اس سے اسی طرح بدگمان ہونے لگا ہوں جیسا کہ اس لاغر سے کتے سے (کہ جو اصل میں آدمی نہیں تھا) ہو گیا تھا۔ سبب یہ تھا کہ شام کو اس کی آمد کے اوقات مقرر نہیں تھے کبھی دن ڈھلے آموجود ہوتا اور کبھی شام کے بعد، اس وقت جب ہم سونے کی تیاری میں ہوتے۔ بس یہی تھوڑی سی خرابی تھی، جو اتنی تھوڑی بھی نہ تھی۔ مجھے لگنے لگا جیسے وہ میری بیوی کی بے چینیوں سے کھیلتا ہو۔ یا جیسے وہ مجھ سے کوئی انتقام لیتا ہو۔ کچھ بھی تھا اس کے بے وقت آنے پر کچھ عجیب سا ضرور لگتا تھا۔ یہ عجیب سا کچھ اور بھی عجیب اس وقت ہوا جب اس کی آمد نے ایک نئی صورت اختیار کی۔

وہ گلی میں دروازے کے ساتھ ٹک کر بیٹھ رہنے کی بجائے کنڈی کھلنے پر صحن میں در آنے لگا۔ وہ در آنے لگا کہیں کمرے میں، دالان میں پورچ میں، کہیں بھی اچانک، بالکل اسی طرح جس طرح کبھی وہ لاغر سا کتا گھس آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا بھی ہوتا کہ دروازہ کھلا رہ جانے کے باعث وہ بغیر آواز کئے اندر داخل ہو جاتا اور کسی کونے کھدرے میں اسے پاکر بچے شور مچانے لگتے... "امی امی کتا...."

بچوں کے شور پر ...... اور کہیں کسی کمرے میں اچانک اسے دیکھ کر رفتہ رفتہ شدید کوفت ہونے لگی۔ کبھی کبھی تو یوں بھی لگتا جیسے میں نے وہ نہیں بلکہ وہی لاغر سا کتا دیکھ لیا

.... وہی لاغر سا کتا جو اسی طرح گھس آتا تھا۔ ایک دفعہ تو یہ بھی خیال آیا کہ کہیں واقعی
وہی کتا ہی نہ ہو اور آدمی کی شکل میں نمودار ہو گیا ہو..... خیال مضحکہ خیز تھا اور شاید
ہی تنگ نظری کی پیداوار تھا، مگر ایسا ہی تھا۔

اس بوڑھے بھکاری نے میرے دل سے اپنے لیے ہمدردی ختم کر دی تھی۔ وہ مجھے اب
پنے گرد و نواح میں درکار نہیں تھا۔ میں شام ہوتے ہوئے بیرونی دروازے کی کنڈی
ھانے کی احتیاط کرنے لگا۔ میری کوشش ہوتی اسے دروازے کے باہر ہی بھیک دے دی
ئے۔ بلکہ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ وہ لاٹھی کھٹکھٹا کر مسلسل صدا کرتا رہا، میں نے سنی ان
کی، تاوقتیکہ میری بیوی نے نہ سنا اور دروازہ کھول دیا۔ معلوم نہیں مجھے اس کے مسلسل
ا کرنے اور دروازہ کھٹکھٹانے اور انتظار کرنے اور کرتے ہی رہنے میں کیوں لذت ملتی
، شاید میں اب اسے اپنے دروازے پہ نہیں چاہتا تھا۔

اسے بھیک دینے میں قباحت نہیں تھی، قباحت اسے اپنے معمول کا حصہ بنانے میں
۔ مگر میری بیوی نادان تھی، نہیں سمجھتی تھی.... وہ نہیں سمجھتی تھی اسی لیے اس کی
داری میں جتی رہتی تھی جبکہ میں تاک میں تھا کہ کوئی ایسا دن، کوئی ایسی شام، جو اسے
ے آس پاس سے جدا کر دے جیسا کہ اس سے قبل کتوں اور بھکاریوں کے ساتھ
... پھر ایک دن آیا۔

اس ویرانے میں جہاں ابھی ایسی زیادہ آبادی نہیں ہوئی تھی تمام کنبے کا کہیں کسی
ب کے لیے کوچ کرنا اور رات کہیں باہر بسر کرنا خدشے سے خالی نہ تھا۔ جب بھی کبھی
وقع آتا مجھے عام طور پر شب کی چوکیداری کے لیے پیچھے رک جانا پڑتا۔ اس روز بھی
ہی ہوا۔

بچے کسی تقریب کے لیے رخصت ہوئے اور بیوی نے جانے سے قبل جاتے ہوئے
اور بہت سی ہدایات کا مجھے پابند کیا اس بوڑھے کے بارے میں خصوصی طور پر یاد دہانی
۔ وہ شام کو کسی وقت بھی آسکتا تھا اور مجھے اسے کھانا فراہم کرنا تھا جو وہ میرے علاوہ
کے لیے بھی تیار کر کے رکھ گئی تھی۔

آج موقع مناسب تھا...... ایک مرتبہ تو خیال آیا کہ جب وہ آئے تو اسے دروازہ نہ کھولا جائے مگر پھر خود ہی خجالت محسوس ہونے لگی۔ میں اپنی بیوی سے کیا ہوا عہد کیسے توڑ دیتا۔

اس شام وہ دیر تک نہیں آیا۔ گھر میں بچوں کا شور نہیں تھا۔ تنہائی کے آسیب نے گھیرا اور میں اپنے بستر میں گھس کر لیٹ گیا۔ پھر معلوم نہیں کب آنکھیں مند گئیں۔ میں سویا رہ جاتا مگر جیسے دستک سی ہوئی اور آنکھ کھل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بھکاری کہ جسے ہم کتا کہتے تھے دروازے پر آیا کھڑا ہے۔ خوب دھیان دیا مگر ایسا نہیں تھا یہ تیز ہوا کا جھکڑ تھا جس نے ایک دھماکے سے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے تھے۔ آسمان بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور ہوا شور مچاتی پھر رہی تھا' بجلی چلے جانے کی وجہ سے بالکل تاریکی ہوگئی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کی اور پڑ رہا۔ شاید آج وہ نہ آئے میں نے خیال کیا' موسم ہی کچھ ایسا تھا۔ پھر بوندا باندی شروع ہوئی اور بوچھاڑ دروازوں اور کھڑکیوں پر پڑ کر شور مچانے لگی۔ مجھے نیند پھر بہالے گئی۔

نیند مجھے پھر بہا لے گئی اور میں سو گیا۔ مگر خواب اور خیال میں اسی بھکاری کی حکمرانی تھی۔ جو کبھی آدمی بن کر نمودار ہوتا کبھی کتا۔ ایک دستک سی ہوتی رہی' مسلسل دستک........ "کتے کو دروازہ کھولو...... کتے کو دروازہ کھولو....."

ابھی سویا ہوں گا یا بہت دیر سویا ہوں گا کہ یوں محسوس ہوا کہ جیسے میری چارپائی کے نیچے کوئی کتا کرلایا ہو۔ یہ خواب و خیال کی بات نہ تھی۔ بالکل زندہ اور جیتی جاگتی آواز تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ کھڑکیاں دروازے بند تھے مگر ملگجی سی روشنی پھر بھی پھیلی تھی۔ میں جھانک جھانک کر چاروں طرف دیکھتا رہا مگر وہاں کوئی کتا کب تھا جو کرلاتا۔ یہ میرا وہم تھا۔

......اصل حیرت اس وقت ہوئی جب ذرا حواس بحال ہوئے تب معلوم ہوا کہ میں جسے کتے کی کرلاہٹ سمجھا تھا وہ تو اس بوڑھے بھکاری کی آواز تھی جو کمرے میں میری چارپائی کے نیچے سے نہیں بلکہ باہر گلی سے آرہی تھی۔ وہ تھا اور ضرور تھا اور گیٹ پہ لاٹھی کھٹکھٹا

کے مسلسل صدا کر رہا تھا۔ "اس کتے کو دروازہ کھولو...... اس کتے کو دروازہ کھولو....." یہ آواز سن کر میں بھونچکا رہ گیا' ایک کپکپاہٹ سی محسوس ہوئی.... اسے پچھلی شام آنا تھا۔ تو کیا وہ پچھلی شام سے دروازے پر موجود ہے اور پکار رہا ہے۔ مگر بارش اور تیز جھکڑ.....؟؟ .... میں لپک کر چارپائی سے اترا اور بوکھلا کر گیٹ کی طرف بھاگا...... جب میں کنڈی کھول رہا تھا اس وقت بھی اس کی آواز آ رہی تھی..... ملتجیانہ سی آواز' جیسے رفتہ رفتہ ڈوب رہی ہو..... ہچکیاں لے رہی ہو....... "دروازہ کھولو.... دروازہ کھولو...." میں نے گیٹ پر پہنچتے ہی تیزی سے کنڈی کھولی اور سرعت سے دروازہ کھول دیا۔ ایسے جیسے کوئی ڈوبنے والے کو ایک جھٹکے سے نکال باہر پھینکتا ہے۔

گیٹ کھول دیا۔ مگر نہ ہی کھولتا تو بہتر تھا۔ سامنے تو صرف حیرانی تھی.....!

رات بارش بہت ہوئی تھی۔ گلی کیچڑ سے بھری ہوئی تھی۔ سامنے والے گھر کی ایک دیوار جو نئی نئی تعمیر ہوئی تھی وہ گری پڑی تھی۔ شاید ابھی سوئے پڑے تھے۔ پرندوں نے ابھی اڑنا آغاز نہیں کیا تھا۔ میں اپنے گیٹ پہ کھڑا تھا۔ بھکاری کی مسلسل صدا مجھے باہر لائی تھی مگر حیرت کی بات تھی وہ سامنے کہیں بھی نہیں تھا۔ بلکہ گیٹ کھولتے ہی مجھے جس کا سامنا ہوا وہ اس کتے کی لاش تھی۔ اسی لاغر سے کتے کی جو ایک زمانے میں ہمارے گھر کے سامنے کچرے والے ڈھیر کی جگہ پر پڑا رہتا تھا اور جو اب مدت ہوئی کہیں اور چلا گیا تھا۔

میں پریشانی اور حیرانی میں کچھ دیر ادھر ادھر بولایا سا پھرتا رہا۔ میں نے خود اس کی آواز سنی تھی۔ مسلسل آواز...... لیکن اب وہ کہاں چلا گیا تھا..... کہیں ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ اور یہ کتا؟ تو یہ کس کی آواز آتی رہی تھی.... کتے کی ؟؟... اس لاغر سے کتے کی ؟؟؟... مگر نہیں میں دھوکا نہیں کھا سکتا۔

میں پھرتا رہا اور ڈھونڈتا رہا اور شام ہو گئی.... پھر اگلا دن نمودار ہوا۔ پھر شام ہو گئی.... پھر دن بیت گئے..... اور زمانہ گزر گیا۔

زمانہ گزر گیا۔ گھر تعمیر ہو گئے۔ گلیاں آباد ہو گئیں۔ ہر چیز معمول پر آ گئی۔ بچے بڑے ہو گئے۔ میری بیوی کو نئی چہل پہل مل گئی.... بیتے ہوئے اکثر واقعے فراموش ہوئے۔ سوائے

اس کے کہ اب بھی جب کبھی کسی شب بہت تاریکی ہوتی ہے اور بارش کی بوچھاڑ پڑتی ہے اور کوئی فقیر دروازے پر صدا کرتا ہے یا کوئی کتا تھوتھنی آسمان کی طرف اٹھائے کرلاتا ہے اور کرلاتا ہی جاتا ہے، تو اک ذرا دیر کو مجھے اس کی یاد آجاتی ہے۔ یا پھر مجھے اس وقت اس کی یاد آجاتی ہے جب میں کوئی نچڑی ہوئی ہڈی دیکھتا ہوں یا سوکھی روٹی کا کوئی ٹکڑا جس پر سبزی مائل پھپھوندی عود کر آئی ہوتی ہے۔

میری بیوی کا اب بھی یہ خیال ہے کہ وہ تو اسی رات مرگیا تھا جس رات وہ آخری بار ہماری چوکھٹ پر آیا تھا.... اور وہ لاش جو صبح گیٹ پر پڑی ملی تھی اسی کی تو تھی۔ مگر نہیں اس بے چاری کو کیا معلوم .... وہ تو اس دن گھر پر ہی نہیں تھی اور نہ ہی بچے تھے.... میں اکیلا تھا..... مگر کیا خبر ؟؟؟

تو ایسا تھا کہ میں نے اسے اپنے جسم پر رینگتے ہوئے محسوس کیا تھا اور کپڑے جھاڑ کر اٹھ بیٹھا تھا۔ زمین پر لیٹنے میں یہی ایک تو قباحت ہے کہ کوئی نہ کوئی کیڑا پتنگا کپڑوں کے اندر رینگ جاتا ہے اور کہیں کاٹ بیٹھتا ہے۔ بے ضرر کیڑوں کے کاٹنے سے تو اک ذراسی جلن ہوتی ہے اور کچھ تھوڑی سی سوجن سی۔ لیکن اگر کوئی ضرر رساں کاٹے تو موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ میں اسی لئے زمین پر بیٹھنے سے گریز کرتا رہاتھا۔

جب اس دن میں شہر سے چلا تو ایک گاڑی مجھے گاؤں سے لینے آئی تھی۔ راستہ کچھ زیادہ طویل نہیں تھا۔ چند کوس کی بات تھی مگر گاؤں کے راستے پر پڑنے سے پہلے ہم بہت دیر شہر ہی میں مختلف کاموں کے لئے چکراتے پھرے اور پھر جب گاؤں کی پگڈنڈی آئی تو راستہ ناہموار تھا۔ یوں پہنچنے میں وقت قدرے زیادہ لگا اور تھکن الگ ہوئی۔ چلتے ہوئے کہیں درمیان میں رکنے کا پروگرام تو نہیں تھا مگر جب ہم آموں کے ایک باغ کے پہلو سے گذرے تو گاؤں کے نمبردار نے کہ جو میرے ہمراہ تھا مجھے وہاں رکنے اور آم چوسنے کی ترغیب دی اور پھر میرا جواب سننے سے پہلے ہی ڈرائیور کو باغ میں داخل ہونے کا حکم سنادیا۔

ہم جہاں اترے وہاں نمبردار کی آواز پر چوکیدار اور دیگر کارندوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا جنہوں نے پل بھر میں وہاں چارپائیاں ڈال دیں اور آموں کا انبار لگا دیا۔

ہر چند کہ ہمارے لئے چارپائیاں بچھائی گئی تھیں مگر اس پر فضا مقام نے کچھ ایسا اثر کیا کہ میں چارپائی کو چھوڑ گھاس کے ایک قطعے پہ جا بیٹھا۔ بس یہی میری غلطی تھی۔

شام سے پہلے موسم خوشگوار ہوگیا تھا۔ ہلکی خنک ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ گھاس پر لوٹیں کھانا اچھا لگتا تھا۔

نمبردار خود تو کسی کام کو نکل گیا مگر اس کے آدمی میری خدمت پر مامور ہو گئے۔ میں ان کے درمیان بیٹھا کچھ دیر تو آم چوستا رہا پھر گھاس پر چت لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں اور موسم کا مزا لینے لگا۔ مجھے آنکھیں موندے دیکھ کر باغ کے کارندے اپنے اپنے کام سے ادھر ادھر ہو گئے البتہ ایک آدمی پاؤں دابنے کو رک گیا۔ میری وردی سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ میں یہاں اس قتل کی تفتیش کے لئے آیا ہوں جو چند روز پہلے اسی گاؤں میں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پاؤں دابنے والا آدمی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔

"کیوں صاحب آپ یہاں تفتیش کے لئے آئے ہو۔"

"ہاں۔ میں نے مختصر سا جواب دیا اور آنکھیں بند رکھیں۔"

"قتل ہوا تھا جی۔ اسی باغ میں۔" اس نے انکشاف کیا۔ میں چونکا۔ آنکھیں کھولیں اور ذرا سا سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھا اس کا دھوپ سے مارا سوکھا سیاہ بدقوق چہرہ ہر قسم کے احساس سے عاری تھا۔ اس نے آنکھیں نہیں اٹھائیں بلکہ اسی یکسوئی سے سر جھکائے پاؤں دابنے میں مصروف رہا۔

"ذیلدار صاحب نے اچانک پستول نکالا اور اچانک داغ دیا۔" اس نے بات جاری رکھی۔

"جھگڑا کیا تھا۔۔؟" میں نے اسے کریدا۔

"کمی کمہاروں کا کیا کسی سے جھگڑا ہونا ہے جی۔ بس مقتول باتونی بہت تھا۔"

میں نے سر پھر زمین پر ٹکا دیا اور چت لیٹ کر درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر دکھائی دینے والے آسمان کو دیکھنے لگا۔ اس نے گفتگو جاری رکھی۔ "بس نکمی باتیں کئے جارہا تھا۔ ذیلدار صاحب نے ایک دفعہ ٹوکا۔ تھوڑی دیر کو چپ کر گیا۔ پھر بولنے لگا۔ پھر ٹوکا پھر چپ کر گیا۔ تب ذیلدار صاحب نے کہا اب جو تو بولا تو گولی مار دوں گا۔"

"تو انہوں نے گولی مار دی۔" میں نے ہنس کر بے یقینی سے پوچھا۔ "ہاں جی۔" اس نے میری ہنسی کو نظر انداز کیا اور بات جاری رکھی۔ "بس جی نا سمجھ تھا۔ عادت تھی اس کی۔ زیادہ دیر چپ کہاں بیٹھ سکتا تھا۔ پھر کوئی قصہ لے بیٹھا۔ بڑے قصے کہانیاں آتے تھے جی

اسے۔ سارا دن گاؤں گاؤں پھرتا تھا۔ ہر بات کی اسے خبر ہوتی تھی۔" اس مدقوق چہرے والے کی ذہن کی رو کسی اور ہی طرف گھومنے لگی۔ میں نے درمیان میں ٹوکا۔ "یار بات تو مکمل کرو۔ پھر ہوا کیا۔؟"

ہونا کیا تھا جی - اس کی اپنی غلطی تھے۔ ذیلدار صاحب نے تکئے کے نیچے سے پستول نکالا اور گولی داغ دی۔ یہ کھاؤ ناجی۔ سارے آم تو اسی طرح پڑے ہیں۔" بات کرتے میں اس کی توجہ آموں کی طرف گئی اور وہ وضع داری پر اتر آیا۔ میں نے اسکی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کروٹ لی اور کہنی کے سہارے پہلو کے بل لیٹ گیا۔

"تو تم وقوعہ کے وقت موجود تھے۔"

"ہاں جی۔ میرے سامنے ہوا ہے۔"

"مقتول کی کوئی ذیلدار صاحب سے دشمنی تو نہیں تھی۔"

مدقوق چہرے والے نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا جیسے سوچ رہا ہو کہ میں نے مذاق میں بات تو نہیں کی۔ مگر پھر میری سنجیدہ صورت دیکھ کر خود بھی سنجیدہ ہوگیا۔ "توبہ کرو جی توبہ کمی کمین کی ذیلداروں کے ساتھ کس بات کی دشمنی۔ وہ تو میری طرح پشتوں سے نوکر چاکر تھا۔ نمک خور تھا جی ان کا۔ دشمنی کیسی ۔؟"

"تم مقتول کو جانتے ہو۔۔؟"

"جوڑی دار تھا جی میرا۔ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں۔"

مدقوق چہرے والے کی عمر کا ٹھیک اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مشقتوں کا مارا ہوا اس کا جسم اور چہرہ صحیح عمر تک رسائی کو ناممکن بنارہے تھے۔ شاید ادھیڑ عمری میں داخل ہورہا تھا۔ "ٹھیک جائے وقوعہ کون سی تھی۔ میں نے کچھ اور کریدا۔"

"یہی جی یہی۔ جہاں آپ لیٹے ہو۔ بالکل اسی طرح اسی جگہ چت گر گیا تھا۔ آپ کو اس طرح لیٹے ہوئے دیکھتا ہوں تو بس یوں سمجھو جیسے اس کا مردہ پڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔"

بس اسی وقت جس وقت اس نے یہ بات کہی گھاس کا کوئی کیڑا میرے کپڑوں کے اندر رینگ گیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کپڑے جھاڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"کیوں جی - خیریت ہے؟" وہ گھبرا گیا۔

"پتہ نہیں کوئی چیز جسم پر چڑھ آئی ہے۔"

"گھاس ہے نا جی۔ ہر قسم کا کیڑا پتنگا ہوتا ہے۔" اس نے رواروی میں کہا۔ میں ابھی کپڑے جھاڑ ہی رہا تھا کہ اتنے میں نمبردار واپس آگیا۔ اور ہم پھر چل پڑے۔ اس مرتبہ وہ مدقوق چہرے والا بھی ہمارے ہمراہ تھا جس نے پاؤں دابنے میں قتل کا قصہ بیان کیا تھا۔ نمبردار نے بتایا کہ اس کے بھی بیان ہونے ہیں۔ مجھے ذرا تعجب ہوا مگر اس نے آنکھ دبا کے مونچھوں پہ ہاتھ پھیرا "آپ فکر نہ کرو جی سب ٹھیک ہے۔" اسے بعض باتوں پہ آنکھ دبانے کی عادت تھی جس کا مطلب ہوتا تھا کہ مذکورہ بات پردے والی ہے۔ میں چپ ہو گیا۔

مجھے شہر سے چلتے ہوئے تھانے دار نے چپ رہنے کی ہی ہدایت کی تھی۔ میری پولیس میں بھرتی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ شہر کے ایک تھانے میں میری تعیناتی تو ہوگئی مگر تادیر کوئی ایسی ذمہ داری میرے سپرد نہیں ہوئی جس کی کشش مجھے پولیس میں لے کر آئی تھی۔ زیادہ تر محرری کا کام ہی سپرد تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کوئی تفتیشی طرز کا کام ملا تھا۔

اسے باقاعدہ تفتیش تو نہیں کہہ سکتے۔ اصل میں مجھے اس کیس کے بارے میں زیادہ معلومات ہی نہیں تھیں سوائے اس کے کہ ایک قتل ہوا اور لاش جس سرکاری اسپتال میں لائی گئی وہ اسی تھانے کی حدود میں تھا۔ نہ بھی ہوتا تب بھی اس گاؤں کے معاملات ہمارے ہی تھانے کی ذمہ داری تھے۔ مجھے لاش کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کی بھی کچھ خبر نہیں تھی۔ ایک شام پہلے تک تو میں بالکل ہی بے خبر تھا۔ رات گئے تھانے دار نے مجھے بلا کر اس گاؤں پہنچنے کے لئے کہا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں میں کوئی موت ہوئی ہے اور مرحوم کی بیوہ نے تھانے میں آکر شور مچایا ہے کہ اس کا شوہر قتل ہوگیا ہے۔ ہم نے ایف۔ آئی۔ آر وغیرہ تو درج نہیں کی تمہیں صرف یہ کرنا ہے کہ گاؤں جاکر ذیلدار سے ملنا ہے اور جو بیان وہ دے یا جس کا بیان وہ دلوائے اس کی رپورٹ بنا کے لے آنی ہے۔ تو اس طرح اس نے مجھے صرف اتنا کام دیا اور سختی سے تلقین کی کہ گاؤں آکر بہت زیادہ کرید کرنے یا غیر ضروری تفتیش کرنے سے گریز کروں۔ شاید ذیلدار سے اس کی اس سلسلے میں کوئی بات ہو چکی تھی۔

مجھے معاملات کی ابھی زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہوئی تھی مگر عملی زندگی کے آغاز پر میرے لئے مناسب یہی تھا کہ میں دی ہوئی ہدایات پر سختی سے عمل کروں۔ اسی لئے مدقوق چہرے والے کی باتوں کو میں نے اپنی چپ کے کھاتے میں ڈال دیا۔ ویسے بھی سارے رستے میں میں نے نمبردار یا ڈرائیور سے اس قتل کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھااور نہ ہی انہوں نے اس معاملے کو چھیڑا تھااور اب ہم ذیلدار کی حویلی کی سمت جارہے تھے کہ وہی ہماری اصل منزل تھی۔

آموں کے باغ کے پیچھے ذیلدار کا ذاتی گیٹ ہاؤس تھا اور اس سے ذرا فاصلے پر درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی اس کی حویلی تھی۔

باہر سے تو حویلی کا ماحول بڑا روایتی ساتھا۔ مگر اندر ڈرائنگ روم میں کچھ بھاری بھرکم جدید آرائش بھی کی گئی تھی۔ ذیلدار ہمارا منتظر تھا اسے ہمارے آنے کی خبر ہوگئی تھی۔ وہ ایک مسہری پہ تکئے پہ کہنی ٹکائے نیم دراز پڑا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ جب ہم پہنچے تو ہرچند کہ اس نے اٹھنا گوارا نہیں کیا مگر حقے کی نے ایک طرف گھما کے ہاتھ کے اشارے سے ”آؤ جی - بیٹھو“ ضرور کہا۔ ہم اس کے سامنے کرسیوں پر براجمان ہوگئے۔ البتہ مدقوق چہرے والا دروازے پر سینے پہ ہاتھ باندھ کے رک گیا۔ ذیلدار نے نمبردار کی طرف دیکھا اور گویا ہوا ”تھانے دار سے میں نے کہا تھا کوئی اپنا آدمی بھیجنا۔“

آپ فکر نہ کرو جی - اپنے ہی آدمی ہیں۔ ابھی نئے نئے بھرتی ہوئے ہیں۔ بڑی نوکری کرنی ہے انہوں نے۔ نمبردار نے ترت جواب دیا۔ ذیلدار نے سنا۔ حقے کی نے اپنی طرف کی اور گڑگڑانا شروع کردیا۔ پھر کچھ توقف کے بعد مدقوق چہرے والے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ موقع کا گواہ ہے اس کا بیان لے لو۔

مدقوق چہرے والے کا بیان تو ذیلدار کو لے ڈوبے گا۔ میں نے سوچا آخر اس کا بیان کیوں لیا جارہاہے۔ میری حیرت بجا تھی مگر میں نے کچھ پوچھا نہیں البتہ میری آنکھوں کی حیرت کو ذیلدار تاڑ گیا۔ ”ہم تو اس دن یہاں تھے ہی نہیں۔ شہر گئے تھے فیکٹری کی بنیاد رکھنے رات کو لوٹے تھے“ اس نے کہا۔ ”شہر میں کئی آدمی گواہ ہیں۔ اور یہ قصہ گاؤں میں

باغ کا ہے۔" نمبردار نے بات مکمل کی۔ باغ کے ذکر پہ اچانک میرے جسم کے ان حصوں میں جلن ہوئی جہاں گھاس کے کیڑے مکوڑوں نے کاٹا تھا۔ یا جہاں میں نے اپنے ناخن بڑی زور سے پیوست کئے تھے۔ مجھے اپنی عادت کے خلاف زمین پر نہیں لیٹنا چاہئے تھا۔ خیر۔ میں نے بیگ کھول کر کاغذ اور پنسل نکالے ۔ گتے پہ لگائے اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ذیلدار حقہ گڑگڑانے لگا۔ اگرچہ مجھے چپ ہی رہنا چاہئے تھا مگر معلوم نہیں میرے ذہن میں کیا الجھن تھی کہ ایک سوال کرنے کو جی چاہا "مقتول کی بیوہ نے....." ذیلدار نے مجھے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ حقے کی نے ایک طرف کی اور پھٹ پڑا۔ وہ معمر آدمی تھا مگر خوشحالی اور خاندانی رعونت نے ایک خاص طرح کا طنطنہ اور دبدبہ اجاگر کر رکھا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور بڑی بڑی آنکھیں باہر ابل آئیں۔

"جھلی ہے حرامزادی۔ میں نے اسے بلا کے کہہ دیا تھا کہ تو جہنمی ہے۔ تو نے اپنے خاوند کا مردہ خراب کیا ہے ۔ شہر میں لے جا کے چیر پھاڑ کرائی ہے۔ لیکن جاہل لوگ ہیں کہاں سمجھتے ہیں۔ مگر سچ تو سچ ہوتا ہے۔" اس نے اپنے کرتے کی بغلی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور لہرایا "یہ ڈاکٹری رپورٹ ہے۔ ڈاکٹر خود آ کے نقل دے گیا ہے۔"

ڈاکٹری رپورٹ میں کیا ہے۔ مجھے ایک ذرا تجسس ہوا تو کاغذ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایسا کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "مقتول کی بیوہ مقدمہ دائر کرنے کی ضد کر رہی تھی مگر تھانیدار صاحب نے......" ذیلدار نے پھر میری بات پوری نہیں سنی اور نہ ہی وہ کاغذ میرے ہاتھ میں تھمایا البتہ بات کا جواب ضرور دیا۔ "بے شک جائے ہزار دفعہ جائے۔ مگر اب نہیں جائے گی شہر۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اس کے۔ سر کا سائیں سر پہ رہا نہیں ہے۔ وکیلوں کے خرچے اس کا باپ پورا کرے گا۔ رل کھل جائے گی۔ میں نے سمجھا دیا ہے اس بلا کے۔ اب نہیں جائے گی۔" ذیلدار نے اپنے مضبوط لہجے کے ساتھ مقتول کی بیوہ کی طرف سے میرے شکوک گویا رفع کئے۔ اور پھر پلٹ کر دق چہرے والے کو دیکھا جو پہلے ہی پتھر کے بت کی طرح ساکت و جامد کھڑا تھا۔ "چل بھئی بول اس دن کیا ہوا تھا۔" اس نے پہلے تو خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا۔ چہرہ اب بھی اس کا ہر طرح کے جذبات سے عاری تھا اور پھر

بولنا شروع کردیا۔ وہ اس طرح بول رہا تھا جیسے چھوٹی جماعت کا کوئی طالبعلم آموختہ سناتا ہے۔

''عصر کا وقت ہوگا ہم باغ میں پیپل کے ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک میں نے درخت پر کوئی پھنکار سی سنی۔ سر اٹھا کر دیکھا تو ایک شاخ سے لپٹا ہوا سانپ تھا جو نیچے لٹکا ہوا تھا۔ میں چیخ مار کر کھڑا ہوگیا۔ میں تو کھڑا ہوگیا مگر اسے کھڑا ہونے کی مہلت نہ ملی۔ سانپ اچانک اس پر گرا۔ چھاتی پہ ڈنک مارا اور تیزی سے پتوں میں روپوش ہوگیا۔ اس کا زہر اتنا شدید تھا کہ میرا جوڑی دار اچانک گرا اور نیلا پڑ گیا۔''

وہ بڑی یکسوئی سے بیان لکھوا رہا تھا کہ معلوم نہیں کیوں میرا ہاتھ کپکپایا اور پنسل کا سکہ کاغذ میں دھنس کر ٹوٹ گیا۔ شاید کہیں جسم پر کپڑوں کے اندر ابھی تک کوئی کیڑا مکوڑا موجود تھا۔ وجود پر کوئی ایسی ہی سنسناہٹ محسوس ہوئی تھی میں نے کندھے اچکائے۔ ادھر ادھر جسم کو مسلا۔ میری اس اچانک کی حالت کو دیکھ کر سب میری طرف متوجہ ہوگئے۔

''کیوں جی۔ خیریت ہے ؟؟'' نمبردار نے تشویش ظاہر کی۔

''باغ میں گھاس پر بیٹھا تھا۔ جسم پر شاید چیونٹیاں چڑھ گئی ہیں۔ اور اب ہر جگہ کاٹتی پھر رہی ہیں۔'' میں نے دوبارہ پنسل سنبھالی اور لکھنے کو مستعد ہوگیا۔ ''ابھی کام ختم کرلو۔ پھر گیسٹ ہاؤس میں جا کر نہا دھو لینا۔ اور کپڑے بھی بدل لینا۔'' ذیلدار نے ہمدردی کا اظہار کیا۔

اگر چہ بہت سے سوالات تھے لیکن میں نے کچھ پوچھا نہیں جس نے جو بیان دیا وہ میں نے لکھ لیا اور پھر سنا کر انگوٹھے لگوا لئے یا دستخط کروا لئے۔ مجھے بہت بے چینی سی ہو رہی تھی کبھی محسوس ہوتا کہ جسم پر کچھ رینگتا پھر رہا ہے کبھی اچانک سکون ہوجاتا۔ لیکن چونکہ چائے آ چکی تھی اس لئے کچھ دیر اور تو بیٹھنا تھا۔ جب بیٹھ گئے تو باتیں بھی ضروری تھیں۔ میں نے ذیلدار کو مخاطب کیا اور ایک احمقانہ سا سوال کر ڈالا۔ ''آپ کے آموں کے باغ تو خاصے وسیع ہیں۔ کافی آمدن ہوتی ہوگی۔؟''

ذیلدار نے سن کر اس طرح میری طرف دیکھا جیسے میں نے کوئی بہت مشکل سی بات کردی تھی۔ وہ کچھ دیر میری طرف دیکھتا رہا پھر بڑے پر اعتماد لہجے میں گویا ہوا۔ ''فکر مندی کی کوئی بات نہیں۔ ہمارے ہاں مہمانوں کے خالی ہاتھ واپس جانے کی کوئی روایت نہیں ہے۔''

جونہی میں نے اس کا جواب سنا مجھے فوراً اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے گر بڑا کر کہا میرا یہ مطلب یہ نہیں تھا جناب......" نمبر دار نے میری بات درمیان میں ٹوکی۔"وہ آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔" اور پھر قہقہہ لگایا۔

میرے ماتھے پر پسینہ آیا تو ذیلدار نے میرا دل رکھنے کو اصل سوال کی طرف رجوع کرنا بھی مناسب خیال کر لیااور بات کو یوں بدل دیا۔ "کیسی آمدن۔ جو کماتا ہوں۔ وہ یہ کیڑے مکوڑے چٹ کر جاتے ہیں۔ کوئی ایک بکھیڑا ہے۔" اس نے اس مدقوق چہرے والے کی طرف اشارہ کیا جو اب بھی بت بنا اپنی جگہ پہ ایستادہ تھاچائے ختم ہوئی تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ عادت کے مطابق ایڑیاں جوڑیں۔ سلوٹ کے انداز میں ماتھے پر ہاتھ رکھ کے سلام کیا اور نمبر دار کے ساتھ باہر نکل آیا۔ اب میں واپس جانا چاہتا تھا۔

میں واپس جانا چاہتا تھا مگر نمبر دار نے مجھے واپسی کی اجازت نہیں دی بلکہ اپنے ہمراہ گیسٹ ہاؤس لے آیا۔ شام جلدی گہری ہوگئی تھی اور اس کا اصرار تھا کہ میں کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتا۔ مجھے بے چینی تھی مگر کوئی چارہ نہ تھااس کی ضد آڑے آرہی تھی۔

جب تک کھانا آتا میں نے نہا دھولیا۔ نہانے سے بشاشت سی آگئی۔ اب سکون تھا۔ گیسٹ ہاؤس شاید شہری مہمانوں کے لئے استعمال ہوتا تھا اس لئے اس میں ہر طرح کی جدید سہولت موجود تھی۔ "گاؤں میں خاص آرام دہ جگہ بنائی ہے آپ نے۔" میں نے کھانا کھاتے مرعوب ہوکر نمبر دار سے کہا۔ "ہاں جی۔ جو کوئی آتا ہے۔ پھر یہاں سے جاتے تعریف ہی کرتاہوا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی یہاں دو تین دن رہ کے گئے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسا۔

"کون سے ڈاکٹر صاحب؟۔ وہی جنہوں نے میڈیکل رپورٹ بنائی ہے۔"

"ہاں جی۔ وہی۔" نمبردار نے جواب دیا۔

ڈاکٹر کے تذکرے پر میرے ذہن میں وہ سوال ابھر آیا جسے میں نے ذیلدار کے سامنے اپنے اندر ہی کہیں دبا دیا تھا۔ اب موقعہ تھا۔

"ڈاکٹر نے رپورٹ میں کیا ہے؟"

"زہر۔" مختصر سا جواب تھا۔

"لیکن۔ اگر کبھی کسی وجہ سے لاش قبر سے نکال کر معائنہ کی گئی تو پھر۔؟؟" میرا ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ پستول کی گولی کو سانپ کے زہر سے بھی بدلا جاسکتا ہے لیکن نمبردار کو میری تشویش نری حماقت معلوم ہوئی وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"لاش قبر میں ہوگی تو معائنہ ہوگا نا بھولے بادشاہو۔" پھر اچانک کچھ خیال کر کے اپنی بات کو نئی سمت موڑا۔ "آپ اپنے آدمی ہو اس لئے یہ بات کی ہے۔ سمجھتے ہونا!" کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کھانا ختم ہوا تو اب میرا وہاں رکنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ نہانے کے بعد جب میں نے دوبارہ کپڑے پہنے تھے تو پہلے انہیں خوب اچھی طرح جھاڑ لیا تھا لیکن غالباً" کوئی بہت ہی ننھے منے کیڑے مکوڑے تھے جو کپڑوں کی درزوں میں پھنس کے رہ گئے تھے میں پھر ان کے اپنے جسم پر چلنے پھرنے کو محسوس کرنے لگا تھا۔ لازم تھا کہ فوراً" گھر پہنچ کر ان کپڑوں سے نجات حاصل کروں۔ انہیں بہا دوں یا جلا دوں۔ کوئی حیلہ کروں۔ ان سے نجات ملے۔ یہ بھی ممکن تھا کوئی اور وجہ ہوتی اور مجھے ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑتا۔ لیکن وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے کپڑے جھاڑتے اور پھر اپنا جسم کھجاتے دیکھا تو نمبردار کو تشویش ہوئی۔

"کیوں جی۔ کیڑے مکوڑے ابھی تک جسم پر چڑھے ہوئے ہیں۔"

۔ "میرا خیال ہے۔ ایسا ہی ہے؟۔"

"آدمی بھی کیا عجیب چیز ہے۔ نمبردار نے فلسفہ بگھارنا شروع کیا۔ جب مرجاتا ہے تو یہی کیڑے مکوڑے اسے کھاتے ہیں۔ اس وقت تو چپ چاپ پڑا رہتا ہے۔ مگر زندگی میں کسی ایک چھوٹی سی چیونٹی کے کاٹنے کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

مجھے نمبردار کے منہ سے یہ بات عجیب سی لگی۔ پھر قبر کے خیال سے ذرا سا خوف بھی محسوس ہوا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں مرچکا ہوں اور قبر میں پڑا ہوں اور کیڑے مکوڑے مجھے کھا رہے ہیں۔ یوں ہی ایک خیال سا آیا اور جسم میں ایک سردی سی لہر دوڑ گئی۔

"اب مجھے چلنا چاہئے۔"

"نہ جی نا۔ آپ یہاں آئیں اور ہمارے ہاں رات نہ ٹھہریں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

"رات کو یہاں ٹھہرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے نمبردار صاحب اور پھر رستہ کون سا اتنا لمبا ہے۔ پیدل بھی چلوں تو گھنٹے ڈیڑھ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"وجہ تو ہے۔" نمبردار مسکرایا۔ "کچھ دیر اور رکو سب سمجھ آجائے گی۔ پھر جانے کا نام بھی نہ لو گے۔" مجھے ذرا سا تجسس ہوا۔ پھر ذیلدار کا یہ جملہ بھی میرے ذہن میں مسلسل گونج رہا تھا کہ ہمارے ہاں مہمانوں کے خالی ہاتھ جانے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اب میں چاہتا تھا جو سامنے آنا ہے جلدی آئے۔ گھر سے چند کوس کے فاصلے پر رات گزارنا کچھ بے معنی سی بات لگ رہی تھی۔ میں بار بار اسے بے چینی سے تک رہا تھا اور وہ کچھ بولے بغیر مونچھوں کے نیچے مسلسل مسکرائے جا رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دیر گزری ہو گی کہ سامنے کھڑکی پر سایہ سا لہرایا۔ کوئی چاپ ہوئی۔ نمبردار نے کڑک کر صدا لگائی "آجاؤ۔ صاحب بہت بے چین ہے۔" دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ پہلے رات کی تاریکی اندر آئی۔ پھر ہوا اور بعد میں وہ۔

وہ بس ایسی ہی تھی جیسی دیہاتی عورتیں ہوتی ہیں۔ سوائے اس کے کہ میں نے دن بھر دھوپ میں جھلسے ہوئے مدقوق چہرے دیکھے تھے اس کی رنگت کچھ کھلتی ہوئی تھی۔ عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ اور جسم بھی برا نہ تھا۔ البتہ آنکھوں میں کوئی سناٹا ٹھہرا ہوا تھا۔

"چل۔ صاحب کے پاؤں داب۔ سارے دن کے تھکے ہوئے ہیں۔" یہ کہہ کر نمبردار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اٹھتا دیکھ کر اس کے آدمی بھی چل پڑے جو ادھر ادھر بے کار کاموں میں مصروف تھے۔ باہر نکلتے ہوئے نمبردار نے مڑ کر دیکھا اور حسب عادت آنکھ دبا کر مسکرایا۔ "چلو جی دروازہ اندر سے بند کر لو۔ ویرانہ ہے۔ کوئی کتا بلا اندر گھس آئے گا۔"

صبح ناشتہ کرتے مجھے محسوس ہوا کہ کل جو مجھے دن بھر کیڑیاں سی کاٹتی رہی تھیں وہ محض میرا وہم تھا۔ گھاس پر لیٹے لیٹے یقیناً" کیڑے مکوڑے جسم پر چڑھ آئے تھے مگر پھر میں نے جھاڑ دیئے تھے۔

اصل میں اس کا انکشاف مجھے رات کو سوتے میں ہوا اور یہ احساس صبح کو بھی جاری رہا

کہ کھال کے باہر تو کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا جو کچھ ہو رہا تھا اندر ہو رہا تھا......... کیڑے کاٹ رہے تھے لیکن کہیں اندر دماغ کے خلیوں میں یا ان رگوں میں جن میں خون دوڑتا پھرتا ہے۔

واپسی پر نمبردار ہمارے ساتھ نہیں تھا البتہ چلنے سے قبل اس نے آموں کے دو ٹوکرے پچھلی سیٹ پر اپنی نگرانی میں رکھوا دیئے تھے۔ ان میں سے ایک میرے لئے اور دوسرا تھانیدار کے لئے تھا اور آنکھ دبا کر سختی سے ہدایت بھی کردی تھی ہم اپنے اپنے ٹوکرے خود ہی کھولیں اس کی دبی ہوئی آنکھ میں کسی اور شے کا بھی اشارہ تھا۔ میں چلتے ہوئے اس کی حد درجہ خوش اخلاقی کے سبب قدرے بے تکلفی پر اتر آیا اسی لئے پہلی دفعہ اسی کی طرح آنکھ دبا کر بولا "نمبردار صاحب آموں کا ٹوکرا تو تھانیدار صاحب کے لئے رکھوا رہے ہو لیکن کوئی پاؤں دابنے والی۔ میرا مطلب ہے وہی۔"

نمبردار نے یہ سنا تو کھل کر ہنسا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔ "صاحب ابھی نہیں۔ ابھی کچھ عرصہ اس پر شہر جانے کی پابندی ہے۔"

"کیوں۔؟" مجھے حیرت ہوئی۔

"آپ نے نہیں پہچانا۔ اس نے رات آپ سے بات نہیں کی۔" وہ حیران ہوا۔

"نہیں۔؟؟"

"یہ وہی تھی نا۔ اس کے گھر والی۔" پھر کچھ توقف کے بعد ہاتھ سے پستول چلانے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "وہ جو آم کے باغ میں۔" ایک قہقہہ اور لگا۔

وہ جب اپنی بات ادھوری چھوڑ کر ہنسا تو مجھے بھی ساتھ تو دینا پڑا لیکن مجھے یقین نہ آیا اسی لئے قدرے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "چھوڑو نمبردار صاحب۔ کیوں جھوٹ بولتے ہو۔ ایسے بھلا کیسے ممکن ہے" مگر وہ اور کچھ نہیں بولا صرف اپنی آنکھ دبائی اور خدا حافظ کہتا مونچھوں پہ ہاتھ پھیرتا گاڑی سے پیچھے ہٹ گیا۔

شہر میں اپنے کوارٹر تک پہنچنے میں نہ ہی کوئی ایسی کوفت ہوئی جیسی پچھلے روز ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی غیر ضروری تاخیر ہوئی۔ کوارٹر پر آموں کے ٹوکرے اتارنے کے بعد میں نے

ڈرائیور سے کہا کہ مجھے تھانے اتار دو۔ وہ تو حکم کا غلام تھا۔ لے چلا۔ وہ ایک کم گو آدمی تھا۔ کل سے اب تک جتنی دیر وہ ساتھ رہا بلاوجہ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ اب بھی سارا سفر چپ چاپ طے ہوا تھا۔ تھانے پہ رکے تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیااور معلوم نہیں کس خیال سے اسے رخصت کرتے ہوئے ہاتھ ملایا تو کوئی اور بات کہنے کی بجائے یہ جملہ ادا ہوا۔

"یار یہ کتنی عجیب بات ہے جب ہم مرتے ہیں تو ہمارے وجود کو کیڑے کھا جاتے ہیں۔"

میری اس بات پر اسے تشویش ہوئی اور اس نے اچانک پوچھا۔ "کیا اب بھی آپ کے جسم پر کیڑے مکوڑے چڑھے ہوئے ہیں۔"

"نہیں۔ مگر اب لگتا ہے کہ جیسے اندر سے کھا رہے ہوں۔"

"اصل میں۔" ڈرائیور بڑے مدبرانہ انداز سے کوئی بات شروع کرتا ہوا گاڑی میں سوار ہوا۔ پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنی طرف والا شیشہ اتارا اور گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے اپنی بات مکمل کی۔ "اصل میں صاحب۔ جب آدمی باہر سے مرتا ہے تو اسے باہر سے کیڑے مکوڑے کھاتے ہیں اور جب اندر سے مرتا ہے تو اندر سے کھاتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور سلام کر کے چلتا بنا۔ وہ تو چلا گیا مگر میں بھونچکا سا کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔ میں تو اسے نرا ان پڑھ آدمی سمجھتا تھا۔ مگر یہ عجیب بات اس نے کی تھی۔

وہ دن گزر گیا۔ میں سرکاری کاموں سے فارغ ہو کر گھر آیا اور وہ کپڑے جلا دئے جو پہن رکھے تھے۔ جب اس پر بھی وجود کو اطمینان نہ ہوا تو ایک قابل ڈاکٹر کے پاس بھی گیا۔ اس نے بہت اچھی طرح دیکھا بھالا۔ آخر نتیجہ یہی نکلا کہ مجھے الرجی سی ہے کوئی بڑا مرض نہیں۔

میرا خیال ہے ڈاکٹر کی رپورٹ درست ہی تھی۔ یہ الرجی ہی ہوسکتی ہے کیونکہ سوائے اس کے کہ جب کبھی آموں کا موسم آتا ہے یا جب کبھی مجھے کسی قتل کی تفتیش کے لئے جاناہوتا ہے اور بہت سے مدقوق چہروں والے میرے اردگرد اکٹھے ہوجاتے ہیں تو صرف تب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بہت سے چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے کھال پر ادھر ادھر کاٹتے پھرنے میں مصروف ہوں۔ کبھی اندر سے کبھی باہر سے۔ ویسے عام طور پر سکون ہی رہتا ہے۔

سانپ

یہ چند دن ہم پر بہت مشکل تھے۔ صبح سے شام ہو جاتی۔ بس مارا مارا پھرتے اور ناکام لوٹتے۔ چلچلاتی دھوپ میں قد آور گھاس میں گھسنا اور تپتی زمین پر اکڑوں بیٹھ کر بین بجانا۔ شام کو نہر کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے پتھروں کے عقب میں گیلی ریت پر بنی لکیروں پر غور کرنا۔ اور رات کو پرانے درختوں کی کھوہ میں جھانکنا یا درختوں کی جھنڈ میں چھپی حویلی کی فصیلوں کے نیچے کان لگاکر کسی پھنکار کو سننے کی کوشش کرنا اور مایوس ہو کر لوٹ آنا۔ یہی مشغلہ تھا۔ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ہم نہ گئے۔ مگر کیا کرتے اسی کام سے یہاں آئے تھے۔ یہی ہم کو کرنا تھا۔

یہ ہمارے علم کی بات نہ تھی۔ ایک اطلاع کی بات تھی۔ ہمیں اس گاؤں میں اس بستی میں ہر طرف سانپوں کا سراغ دیا گیا تھا۔ بتانے والے نے بتایا تھا کہ ایسے ایسے زہریلے سانپ یہاں پائے جاتے ہیں کہ جنہیں تلاش کرنے کی سپیرے حسرت رکھتے ہیں۔ ہمیں بھی یہی خواہش ادھر لے کر آئی تھی مگر تاحال ناکام تھے۔ ناکامی میں واپسی کا راستہ ہی مناسب ہوتا ہے مگر اتمام حجت۔ ہم نے تلاش کرنے کی کوشش تو ترک کی مگر پوچھ گچھ کا عمل شروع کیا۔ لیکن یہ بھی ایک حیرت کی بات تھی کہ اس گاؤں میں کبھی کوئی موت سانپ کے کاٹے سے نہیں ہوئی تھی۔ مرتے ہوئے کسی کا جسم نیلا پڑا تھا نہ منہ سے جھاگ آئی تھی۔ کوئی ایسا قصہ، کوئی ایسا افسانہ نہیں تھا جس سے کوئی سراغ ملتا۔ اب براہ راست سوالات کرنے کا مرحلہ تھا۔ ہم یہ بھی کر گزرے۔ مگر طرح طرح کے جواب تھے اور ہر جواب میں لاعلمی پوشیدہ تھی۔ جس سے پوچھا وہ حیران ہوا۔ کسی نے کہا۔ سانپ کہاں نہیں ہوتے۔ یہاں بھی ہوں گے۔

"کہاں ہونگے۔؟" اس سے ہمارا استفسار تھا۔

"ہم سے پوچھتے ہو۔۔ سپیرے تو تم ہو۔۔ تم تلاش کرو۔" اس کا جواب تھا۔

"ہم تلاش کر چکے۔۔ ہمیں تو کچھ نہیں ملا۔......"

"تم اناڑی ہو۔۔ اس لئے سانپوں کا پتہ لوگوں سے پوچھتے ہو۔۔" وہ ہنسا۔

ہم اناڑی نہیں تھے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اس بستی کا ہر آدمی سانپوں کے ٹھکانوں سے آگاہ ہے۔ اس لئے پوچھتے پھرتے تھے۔ مگر ابھی تک کہیں سے جواب نہیں آیا تھا۔ ہمیں مایوسی میں لوٹ جانا چاہئے تھا لیکن چونکہ ہمیں اپنی اطلاع کی صداقت پر شبہ نہیں تھا اسی لئے سر ٹکراتے پھرتے تھے۔ ہر چند کہ حالت یہ ہوگئی تھی کہ اب ہم اچھا خاصا تماشا بن گئے تھے۔ جو کوئی ہمیں بین بجاتے دیکھتا۔ دیکھتا اور ہنس پڑتا۔ کوئی تمسخرانہ انداز سے کہتا۔۔ کیوں بھئی۔۔ کوئی ملا۔۔ اور کوئی ناصحانہ انداز میں تقریر کرتا۔۔۔ تمہیں کسی نے گمراہ کیا ہے۔ یہاں سانپ کہاں ہیں۔۔ جاؤ کہیں اور جا کر تلاش کرو۔۔

ہمیں بہت دن ہوگئے تھے۔ کوچ ہی مناسب تھا۔۔ دکھی دل کے ساتھ لوٹنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شاید ابھی ہمارے لوٹنے کی گھڑی نہیں آئی تھی۔ اس دن جس صبح ہم نے لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ اسی دن ہم نے ایک سانپ کا سراغ پایا۔ ہماری ڈھارس بندھی۔ ہمیں اطلاع پہ ایمان آیا۔

قصہ یہ ہے کہ اسے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ ابھی صبح پھوٹ رہی ہوگی جب واپسی کے قصد سے ہم نے پگڈنڈی پہ قدم رکھے تو ایک جگہ ہموار زمین پر سانپ گذرنے کا نقش دیکھا۔ لہرئیے بناتا نقش۔ ایک لمحے کو ٹھٹک گئے۔ "سانپ۔"

ہر چند کہ ایک سانپ کی خاطر ہمارا سفر کھوٹا ہوتا تھا۔ مگر یہ اچھا موقع ملا تھا کہ اس سانپ کو پکڑ کر ہم گاؤں والوں کو باور کرا سکیں کہ ہم اناڑی نہیں ہیں۔ اور ہماری اطلاع درست تھی۔ ہم نے اپنے اپنے تھیلوں سے بین نکالی اور بجانا آغاز کی۔ ہم بہت سے تھے اس لئے چاروں طرف پھیل گئے۔ وہ نقش ایک طرف سے آتا تھا اور دوسری طرف کو جاتا تھا۔ کچھ جانے والی سمت کو نکل کھڑے ہوئے تاکہ اسے گرفت میں لے سکیں۔ میں آنے

والی سمت کو چل پڑا تاکہ اگر کوئی اور اس کا بھائی بند ہو تو پکڑ سکوں۔

میں جس سمت کو گیا وہاں ایک چھوٹی سی بستی تھی جہاں ایک گھر میں کہرام مچاتھا۔ کوئی موت ہوئی تھی۔ مجھے خیال کرنے میں وقت نہیں ہوئی۔ ہو نہ ہو۔ یہ اسی سانپ کی کارستانی ہے جو مرنے والے کو ڈس کے کسی دوسری سمت کو نکل گیا ہے۔ مگر خیال غلط تھا۔ ایسا نہیں ہوا تھا۔ جو آدمی مرا پڑا تھا اسے کسی نے قتل کیا تھا۔ اس کی گردن پر انسانی ہاتھوں کے نشان واضح تھے۔ میرے ساتھی بھی دوسری طرف سے ناکام لوٹے اور میں بھی ناکام ہوا۔ ہمارا منہ ایک دفعہ پھر مایوسی نے چڑایا تھا۔ یہ ایسی مایوسی تھی جس میں بے چارگی بھی تھی اور بے بسی بھی - یہ دن بھی ہم نے کھو دیا تھا۔ حالانکہ اسے ہماری واپسی کادن ہونا تھا۔ اب پھر صبح کا قصد تھا۔

مایوسی میں بھی البتہ دن میں ہم نے ایک یہ کام ضرور کر دیا تھاکہ پگڈنڈی پر سانپ گذرنے کا جو نقش تھاوہ ہم نے آنے جانے والوں کو بلاملا کر دکھا دیا تھا تاکہ سند رہے۔ مگر یہ طرفہ تماشہ تھا کہ کسی نے ہماری بات پہ یقین نہیں کیا۔ کسی نے یہ نہیں مانا کہ وہ سانپ گذرنے کا ہی نشان تھا۔ کچھ تو خاموشی سے ہی پلٹ گئے۔ چند ایک نے تمسخر اڑایا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ نقش ہم نے اپنی خفت مٹانے کے لئے خود ہی بنایا تھا۔ البتہ ایک بوڑھا عمروں کا مارا ہوا بینائی سے محروم بوڑھا۔ اس نے ضرور یقین کیا حالانکہ وہ نہیں دیکھ سکتاتھا۔ شاید ہمارا دل رکھنے کے لئے۔

وہ رات چونکہ ہمیں گاؤں میں بسر کرنا تھی اس لئے سوچا کیوں نہ اس بوڑھے سے بھی مل لیا جائے۔ آخر کو اس نے ہمارا دل رکھاتھا۔ اور اگر محض ہمارا دل نہیں رکھا تھا تو پھر بغیر دیکھے سانپ کا نشان کیسے بھانپ لیا تھا۔ بوڑھے نے واقعی محض ہمارا دل نہیں رکھا تھا بلکہ اسے یقین تھا۔ یہ بات ہمیں اس سے اس وقت معلوم ہوئی جب رات گہری ہو گئی تھی۔ وہ اپنی کٹیا میں اکیلا رہتاتھا۔ اس نے کئی نسلیں اپنے سامنے جوانی اور بڑھاپا کاٹتے دیکھی تھیں۔ اس نے ہمیں ایک ایسی کہانی سنائی جو اس نے اپنے پرکھوں سے سنی تھی اور پھر اپنا ذکر بھی کیا۔ اس نے کہا جہاں اب بڑے ملکوں کی حویلی ہے یہاں کبھی ایک چٹیل میدان تھا۔ اور

لوگ ادھر کا رخ نہیں کرتے تھے۔ یہ عام خیال تھا کہ یہاں زہریلے سانپوں کا بسیرا ہے۔ یہ ایک عجیب آسیب زدہ جگہ تھی مگر پھر بڑے ملکوں نے یہاں اپنی حویلی تعمیر کرلی۔ یہ جگہ آباد ہونے سے لوگوں کی آمدورفت بھی ادھر ہوگئی۔ ڈر جاتا رہا۔ مگر میرے بزرگوں کا کہنا تھا کہ آبادی ہو جانے کے باوجود سانپوں کا بسیرا یہاں سے ختم نہیں ہوا۔ وہ اب بھی وہاں رہتے ہیں۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید ہم اس بوڑھے کی بات پر یقین بھی کرلیتے۔ لیکن چونکہ ہم نے اکثر راتوں کو اس حویلی کے گرد سانپوں کو تلاش کیا تھا اور کچھ نہیں پایا تھا۔ اس لئے یقین نہیں کیا۔ ہم نے بوڑھے کو بتایا۔ ''بابا۔ ہم نے اکثر وہاں بین بجائی ہے۔ ہمیں تو کوئی سانپ نکلتا دکھائی دیا نہ ان کی کوئی پھنکار سنائی دی۔''

''یہی تو تمہاری غلطی تھی۔ یہ وہ سانپ نہیں جو بین بجانے سے سامنے آئیں۔ بین کی آواز پر یہ یا تو چھپ جاتے ہیں۔ یا ایسے ساکت ہوکر مرکری مارتے ہیں کہ معلوم نہیں ہوتا کہ آس پاس سانپ ہے۔ یا کوئی مٹی کا بے جان ڈھیلا پتھر۔'' اس نے کہا۔

ہمیں اس بوڑھے کی بات عجیب لگی۔ اب ایسی بات پر کوئی کیا یقین کرے۔ ہم نے تو جب بھی کوئی سانپ پکڑا بین بجاکر پکڑا۔ جب کسی کا سراغ ملا اس کی پھنکار سے ملا۔ مگر بوڑھے کا اصرار تھا کہ جو وہ کہتا ہے اس میں کوئی مغالطہ نہیں۔ اس کا دعوے تھا کہ خود اس نے کئی بار چھپ کر حویلی کی دیواروں کے نیچے راتیں گزاری ہیں اور سانپوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ پھر اس نے ایک آہ بھری اور افسوس سے کہا۔ یہ آنکھیں ایک سانپ کی زہریلی پھنکار ہی کا تو شکار ہوئی ہیں۔ اس کی آنکھوں کی گواہی نے ہمیں مخمصے میں ڈال دیا۔ یہ گاؤں میں پہلا آدمی تھا جس نے سانپوں کی موجودگی کی تصدیق کی تھی اور ان کے سراغ پانے کا طریقہ بھی بتایا تھا۔ مگر دشواری یہ تھی کہ یہ سب حقیقتیں اس وقت سامنے آرہی تھیں جب کہ ہم مایوس ہوکر چلنے کی تیاری میں تھے۔

ایک اور بس ایک اور آخری کوشش۔ اسکے سوا اور آخر کیا نتیجہ ہوتا تھا۔ ہم پھر آمادہ ہوگئے۔ رات بہت ہوچکی تھی اور یہی مناسب وقت تھا۔ ہم نے اپنے تھیلے تو اپنے گلوں میں

ڈالے البتہ اپنی اپنی بین بوڑھے کے مشورے کے مطابق اسی کی کٹیا میں رہنے دی اور حویلی کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

ہم آبادی کے باہر درختوں کے جھنڈ میں چھپی اس حویلی کے پاس دم سادھے ہوئے پہنچے۔ ہم نے سانس بھی نہیں لی۔ پلک بھی نہیں جھپکی۔ قدم بھی نہیں اٹھایا۔ بس رینگتے ہوئے بڑھے اور خاموشی کے ساتھ دیوار کے قریب آگئے۔ قریب آئے اور حیران ہوئے۔ بوڑھے نے جو کہا وہ سچ تھا۔

سناٹے کو ایک سانپ کی پھنکار چیر رہی تھی۔ اور اپنے ہی محور کے گرد گھومنے والی اس کی آنکھیں اندھیرے میں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ پھن اٹھائے ایک بہت بڑا سانپ تھا۔ ایک ناگ تھا۔

وہ ایک ناگ تھا جو حویلی کے پہلو سے برآمد ہوا اور اس پگڈنڈی پر ہولیا جس پر چل کر ہم آئے تھے۔ اس کی رفتار میں بلا کی تیزی تھی مگر ہم بھی دم سادھے ہوئے بڑی سرعت کے ساتھ تعاقب میں لپکتے جارہے تھے۔ دیکھنا تھا کہ پہلے کون جھپٹ کر اسے اپنے تھیلے میں ڈالتا ہے۔ وہ لہریئے کھاتا بڑھتا جارہاتھا اور اپنی آنکھیں اس پر جمائے ہم رینگ رہے تھے کہ اچانک ایک واقعہ رونما ہوا۔

اس پگڈنڈی پر کہ جہاں ہم دونوں آگے پیچھے چلے جارہے تھے کہ ذرا آگے سناٹے میں ایک نسوانی چیخ بلند ہوئی اور ہم دہل گئے۔ دہلے تو نگاہ سانپ سے ہٹ گئی۔ ہم نے بلند ہوکر سامنے دیکھا۔ سامنے دور تک تاریکی کی چادر تنی تھی۔ اور اس چادر پر ایک نقطہ۔ ایک ہیولا ۔ بھاگتا چلا جارہاتھا۔ وہ کسی عورت کی آواز تھی۔ وہ مسلسل چیختی چلاتی بھاگتی چلی جارہی تھی۔ اور اسکے تعاقب میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ پھر یوں معلوم ہوا کہ گھوڑے کی ایال پر جھکے بیٹھے سوار نے ہاتھ بڑھایا اور اپنے آگے بھاگتی جاتی عورت کو دبوچا۔ گھوڑے کی گردن پر ڈالا اور سرپٹ بھاگتا چلاگیا۔ وہ چیخ رہی تھی اور ہمیں سانپ فراموش کرنا پڑگیاتھا۔ ہم تجسس اور تشویش سے اس گھڑ سوار کے پیچھے ہولئے جس نے بھاگتی عورت کو دبوچ لیا تھا۔ ہماری سانس پھول گئی۔ ہمیں اندھیرے میں کچھ معلوم نہ ہوتاتھا کہ وہ کدھر نکل گئے ہیں

سوائے اس کے کہ نسوانی چیخیں ہماری رہنمائی کرتی تھیں۔ پھر گھوڑے کی ٹاپوں کی آوازیں آنا بند ہوگئیں جیسے سفر تمام ہوگیاہو۔ مگر چیخوں کی آواز بدستور تھی۔ معلوم نہیں ان دہلا دینے والی آوازوں کے باوجود گاؤں کے لوگ کیوں سوئے پڑے رہ گئے تھے۔ ہم بھاگتے رہے حتی کہ پہنچ گئے۔

ہم پہنچ گئے۔ اور ہمارے پہنچتے پہنچتے چیخیں سسکیوں میں بدل گئیں اور ہم نے دیکھا کہ وہاں ویرانے میں اک اجڑی ہوئی تاریخی عمارت کے نیم منہدم ستون کے ساتھ بلکھے سے ماحول میں اس تار تار نوجوان عورت کے جسم کی روشنی رفتہ رفتہ بجھ رہی تھی۔ اور وہ دہشت سے مسلسل سسک رہی تھی۔ ہمارے لئے اس میں بھی حیرت تھی مگر اس سے زیادہ حیرت اس بات میں تھی کی وہاں کوئی گھڑ سوار نہیں تھاالبتہ وہ سانپ کہ جسے ہم نے حویلی کے پہلو سے نکلتے دیکھا تھا اس عورت کے جسم کے ساتھ لپٹا پھنکار رہاتھا۔ یہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔ اور گھڑ سوار کہاں ہے۔؟

وہ یقیناً" اس عورت کو ڈس چکا تھاوہ سانپ کہ جو اس سے لپٹا ہواتھا۔ اوریقیناً" اب کچھ ہی لمحوں میں اس کے جسم نے نیلا پڑ جانا تھا منہ سے جھاگ نکلنا تھی۔ ہم اس سانپ کی طرف بڑھے مگر وہ ہماری نسبت زیادہ مستعد تھا۔ پلک جھپکتے میں اس کے وجود سے اترا اور لہریئے کھاتا باہر ویرانے کی طرف چلا............ ہم اس کے پیچھے لپکے............ مگر اندھیرے میں دو ایک ساعت ہی اس کا وجود دکھائی دیا پھر تاریکی کی نذر ہوگیا۔ کچھ دیر تک اس کی پھنکار سنائی دی۔ پھر آنا بند ہوگئی۔ اس کی پھنکار تو آنا بند ہوگئی مگر گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی جیسے کوئی گھڑسوار اپنے سفر پر روانہ ہواہو۔

ہم اپنی حیرتوں کوموقوف کرکے پھر پلٹے۔ اب ہمیں اس عورت کی فکر تھی جو چند گھڑیوں کی مہمان تھی۔ وہ نیم منہدم ستون کے ساتھ لگی بیٹھی تھی جب ہم نے اسے چھوا۔ جب ہم نے اسے چھوا تو وہ اپنے ہی زور پر زمین پہ ڈھلک گئی۔ اس کا بدن بھی تار تار تھا۔ اور اس کا لباس بھی تار تار تھا۔

ہم سپیروں کے پاس سانپ کے کاٹے کا علاج موجود ہوتا ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ

اس کا جسم نیلا نہیں پڑا تھا۔ نہ ہی اس کے منہ سے جھاگ آئی تھی۔ کوئی آثار ایسے نہ تھے جو سانپ کے ڈسنے کا پتہ دیتے حالانکہ ہم نے خود اسے ڈستے ہوئے دیکھا تھا۔ حیرت کی بات تھی۔

اور حیرت کی بات تھی کہ اس کے جسم پر سانپ کے کاٹے کا کوئی نشان نہیں انسانی ہاتھ کی خراشیں تھیں اور گھوڑے کے سموں کے بے شمار نشان تھے جیسے اسے کسی گھوڑے کے قدموں تلے روندا گیاہو۔ کچلا گیا ہو۔ یہ اور بات کہ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں کسی آدمی کی نہیں سانپ کی دہشت ساکت ہوئی کھڑی تھی۔

ہم نے اس عورت کے پاس کھڑے ہوکر ایک دوسرے کو دیکھا مگر اندھیرا ہمارے درمیان حائل تھا۔ پھر ہم میں سے ایک بولا۔ ”کیا خبر وہ گھڑ سوار سانپ ہو۔ اور جون بدن کر آگیا ہو۔“ یہ سنتے ہی کسی دہشت نے ہمیں اسیر کیا اور ہم لپک کر باہر آگئے......... باہر اندھیرے کی چادر اور بھی دبیز ہوگئی تھی اور سناٹا بولنے لگا تھا۔

”کیا خبر اس بستی کا ہر آدمی ہی سانپ ہو۔“

یہ کوئی دوسرا تھا۔ معلوم نہیں اس کی بات نے کیا اثر کیا ہماری رفتار میں تیزی آئی اور ہم نے گاؤں کا رخ کرنے کی بجائے اس راستے کا رخ کیا جو اس گاؤں اس بستی سے باہر نکلتا تھا۔ ہم تیزی سے چلتے جارہے تھے جب ہم میں سے ایک اور آواز ابھری۔

”یہ بھی ہوسکتا ہے کہ سب نہ ہوں۔ کوئی کوئی ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس حویلی میں۔؟“

اب ہم بھاگنے لگے تھے۔ فضا میں چاروں طرف سے سانپوں کی پھنکار آتی سنائی دیتی تھی اور آسمان پر ستارے نہ تھے۔ سانپوں کی اپنے ہی محور کے گرد گھومتی آنکھیں تھیں۔

ہماری سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ جسم پر کپکپی تھی مگر رکنے کا مقام نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہوتے ہم اس بستی سے نکل آئے۔

بستی سے تو نکل آئے مگر بھاگتے میں یہ بھی دھیان نہ رہا کہ ہم اپنی اپنی بین تو اسی اندھے بوڑھے کے پاس چھوڑ آئے تھے جس نے سانپوں کا سراغ دیا تھا۔ مگر اب کیا ہوسکتا

تھا۔ واپسی میں ہر طرح کے خطرے پوشیدہ تھے۔ ہو سکتا ہے وہ بوڑھا بھی.....

ہم نے اس بستی کا خیال ترک کیا۔

چڑیا

سرپھری ہوا پھر کسی کی تلاش میں تھی.........

موسم کچھ ٹھیک نہیں تھا کہ ایزل پر کینوس تھا کینوس پر تصویر تھی۔ محنت رائگاں جانے کا دھڑکا تھا۔ مصور کو کسی سائباں کی تلاش تھی۔

گھروں کے دروازے بند تھے سوائے ایک کے کہ جس کی اوٹ میں کھڑی عورت کا آنچل دروازے سے باہر رقص میں تھا۔ ہوا تال دے رہی تھی اور چڑیاں گیت گاتی تھیں۔

چڑیاں گیت گاتی تھیں کبھی کسی پیڑ کی شاخوں میں یکجا ہو کر، کبھی گھروں کی منڈیروں پر قطار اندر قطار کبھی زمین پر غول در غول۔

مصور گیت گاتی چڑیوں کو، دروازے سے لگی عورت اور اس کے آنچل کو اپنی گرفت میں لانے اور تصویر کر دینے کے جتن میں تھا مگر موسم کا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ سر پھری ہوا کا کیا اعتبار۔

کیا اعتبار اس ہوا کا کہ جو کبھی کبھی تو دھیرے دھیرے چلتی ہے۔ یونہی اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ بھلی لگتی ہے۔ مگر بگولوں کی شکل اختیار کرے تو شور مچاتی ہے۔ اڑا لے جاتی ہے۔ کسی اور مقام پر۔ کسی اور دیس میں جا اتارتی ہے۔ پھینک آتی ہے۔ احتیاط لازم ہے۔

احتیاط لازم ہے کھلے پانیوں میں ان کشتیوں کو کہ جن کے بادبان پھڑپھڑانے لگے ہوں کاغذوں کے ٹکڑوں کو، دروازے سے لگی عورت کے آنچل کو اور اس چڑیا کو جو اپنے غول سے جدا ہو کر تنہا ہو گئی ہو اور زمین پر اتر آئی ہو یا اوپر کہیں آسمان پر بہت بلند پرواز کر گئی ہو۔ چڑیوں کو عام طور پر اپنے غول ہی میں رہنا ہوتا ہے۔ وہ جب سرشار، ہو کر شاخوں سے نکلتی ہیں تو ایک ساتھ، کہیں اترتی ہیں تو ایک ساتھ - ایک ساتھ کسی شاخ پر، ایک ساتھ

کسی گھر کی منڈیر پر، اڑنا ایک ساتھ اور بولنا ایک ساتھ۔ یہی چڑیوں کا قرینہ ہے۔ یہی ان کا چلن ہے۔ مگر وہ تنہا ہوگئی تھی۔ وہی جو اپنے غول سے جدا کھیلتی تھی۔ مصور پر فکر مندی کے آثار تھے۔

موسم کا کچھ ٹھیک نہیں تھا مگر اس تنہا چڑیا کو شاید ہوا سے کھیلنا مرغوب ہوا تھا۔ حالانکہ سرپھری ہوا کا کیا اعتبار۔ اس سے کیا کھیلنا۔ مگر وہ جو تنہا ہوگئی تھی اپنا آپ فراموش کر بیٹھی تھی۔ اسے اس ان دیکھی ان جانی ہوا سے کچھ تعلق ہوگیا تھا۔ وہ اسے شاید دیکھنا چاہتی تھی۔ جاننا چاہتی تھی۔ محسوس کرنا چاہتی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے چلنے والی ہوا اس کے ارد گرد مرغولے بناتی اسے گدگداتی۔ وہ جہاں بیٹھی ہوتی وہ وہیں آکر سر پٹختی۔ ہوا سر پٹختی تو وہ اڑ جاتی۔ جگہ بدل لیتی۔ وہ جگہ بدلتی تو ہوا بھی سمت بدلتی پہنچ جاتی۔ ایک کھیل تھا ان دیکھی ہوا اور چڑیا کا۔

مصور دونوں کو دیکھتا تھا۔ ہوا سے کھیلتی چڑیا اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں سمائی ہوئی تھی اور انگلیوں کی پوروں میں خاکستری رنگ مچل رہے تھے۔ مگر ابھی گرفت میں اس طرح نہیں آئی تھی کہ کینوس پر نقش ہوجاتی۔ تصویر بن جاتی۔ ابھی تو وہ فکر مند تھا۔

وہ چڑیا کو تصویر کرنا چاہتا تھا ہوا کو نہیں۔ مگر ہوا جب زمین پر سر پٹختی اور گرد اڑاتی تو چڑیا چھپ جاتی۔ خاکستری رنگ اپنے دامن میں اسے چھپا لیتا۔ مصور اندازہ نہ کرسکتا کہ گرد اڑی ہے یا چڑیا۔ اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔

اس کا دل دھک سے رہ جاتا اگر اسے معلوم ہوتا کہ ہوا اس عورت کا آنچل اڑا لے جائے گی جو دروازے سے باہر رقص میں تھا.... ہوا میں جب تیزی آئی تو پیڑ جھولنے لگا زمین سے ٹوٹے ہوئے پتے اور کاغذوں کے بیکار ٹکڑے بلند ہونے لگے۔ کھڑکیاں دروازے کھلنے اور بند ہونے لگے۔ اور عورت کا آنچل اس کی گرفت سے باہر ہوکر بلند ہوا اور پرواز کر گیا۔ وہ چاہتی تو اس کے تعاقب میں لپکتی باہر آتی اور چل پڑتی ڈھونڈلاتی۔ مگر باہر تو ہر چیز اس کے کھلے ہوئے بکھرے ہوئے حال پر قہقہہ زن ہونے کو منتظر تھی وہ باہر کیسے آتی۔ گھبرا کر پیچھے ہٹی۔ دروازہ بند کیا اور مرکری مار روتی سسکتی خواب کے سفر پر روانہ ہوگئی۔ طوفان

کا شور و غوغا بلند ہو گیا۔

طوفان کا شور و غوغا بلند ہو گیا۔ ہیولے اٹھنے لگے۔ گرد و غبار پھیلنے لگا۔ سر پھری ہوا اور بھی سودائی ہوئی۔

ہوا جب شدت اختیار کرتی ہے تو زمین پر بھی بگولے بناتی ہے اور آسمان پر بھی۔ وہ ہوا جو آسمان پر گردش کرتی ہے اس کی زد میں پرواز کرنے والے پرندے بھی آتے ہیں۔ تو جو ہوا گردش کرتی ہوئی آسمان کی طرف بلند ہوئی اس کی زد میں آئے ہوئے سب پرندے ناگہانی کا شکار ہوئے اور ناگہانی کا شکار ہوئے سوکھے ہوئے پتے اور بے کار کاغذوں کے ٹکڑے۔ ان کی حالت کٹی ہوئی پتنگ کی طرح تھی۔ سب پرندے اڑنا بھول گئے تھے یا ان کے پر اڑنے کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ بے بسی اور بے چارگی میں اوپر اچھال دیئے جاتے۔ پھر نیچے دھکیلے جاتے۔ ڈوبتے اور ابھرے آتے۔ ابھرتے اور ڈوب جاتے۔ ایسے بہت کم تھے جو مشاق تھے۔ جو مشاق تھے انہوں نے جسم ڈھیلے چھوڑے اور ہوا کے دوش پر تیرنے لگے۔ باقی بے بس ہوئے اور بے بس ہوئی وہ چڑیا جو تنہا ہو گئی تھی۔

تو تنہا چڑیا ہوا کی زد پر آگئی تھی۔ گردش کرتی ہوئی ہوا۔ جو زمین پر بھی تھی اور بلندی پر بھی۔ اور چڑیا کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ ہوا کے رحم و کرم پر ہے۔ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے تو تب معلوم ہوا جب ہوا کا ایک تھپیڑا ایسا بھی آیا جو اسے بگولے کے حصار سے باہر ایک گھر کی منڈیر پر پھینک گیا۔ وہ ابھی ہانپتی ہوئی اپنے حواس بحال کرنے کے جتن میں تھی کہ ہوا نے پھر اس کا تعاقب کیا وہ ہڑبڑا کر اڑی اور منڈیر کے نیچے گھر کے ایک کھلے روشندان پر جا بیٹھی اور پھر ادھر اندر کود گئی۔ ہوا اس کے پیچھے آئی مگر اندر کہاں جاتی۔ اور تو کچھ نہ ہوا دھکیل کر اس کے پیچھے روشندان بند کر دیا۔

اندر سکون تھا۔ ایک ٹھنڈا بے معنی سکون۔ کیوں نہ ہوتا؟ طوفان تو باہر رہ گیا تھا بند روشندان کے پیچھے۔ چڑیا نے ایک جگہ پاؤں نکائے۔ کچھ دیر بیٹھی ہانپتی رہی۔ پھر یہ خیال کر کے کہ طوفان تو تھم چکا اب آسمان کی طرف بلند ہونا چاہئے پروں کو کھولا اور چہچہہ کرتی اٹھی اور اپنی جگہ سے بلند ہو گئی۔ لیکن یہ تو بے خبری کی اڑان تھی اس لئے کہ اوپر

آسمان نہیں تھا۔ چھت تھی۔ ٹکرائی اور گرتے گرتے بچی۔

یہ آسمان کو کیا ہو گیا تھا۔ اس نے اسے رنگ بدلتے تو دیکھا تھا' شکل بدلتے نہیں۔ اور اب اس نے صورت بھی بدل لی تھی۔ چھت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

تو بلندی پر چھت تھی اور چھت کے نیچے کمرے تھے اور دیواریں تھیں۔اور گھر کا سازو سامان تھا اور فرش پر ایک طرف مرکری مارے سوئی پڑی عورت تھی جو اگرچہ حالت خواب میں تھی مگر خواب میں بھی اسے بڑ بڑ دیکھتی تھی۔

وہ اسے دیکھتی تھی جو محض ایک چھوٹی سی چڑیا تھی۔ ناسمجھ۔ کم فہم۔ جو خالی کمروں میں اڑتی پھرتی تھی۔ یہ کوئی اڑنے پھرنے کا مقام تھا؟ ۔ کبھی چھت سے ٹکراتی۔ کبھی دیواروں سے۔ اور جب گرنے لگتی تو گرتے گرتے کہیں بھی پاؤں ٹکا دیتی۔ چھت کے پنکھے پر۔ دیوار پر لگی تصویر پر۔ یا کسی کھونٹی پر۔

وہ بولتی تو اس کی آواز خوب گونجتی۔ وہ اپنی صدائے بازگشت پر دھوکا کھا جاتی۔ کہیں بیٹھے بیٹھے سمجھتی کہ کوئی دوسرا بھی وہاں موجود ہے۔ کوئی چڑیا۔ کوئی اس جیسی۔ پھر اٹھتی اور اڑتی۔ اڑتی اور کسی اور کمرے میں پہنچ جاتی۔ مگر اندازہ نہ کر سکتی کہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ اندر سے یا باہر سے۔

باہر تو بہت سی آوازیں تھیں۔ ہر طرح کی آوازیں اور ان ہر طرح کی آوازوں میں چڑیوں کی چہکار بھی تھی مگر اندر سکون تھا۔ ٹھنڈا سکون اور خاموشی۔ آدمی کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ باہر کی آوازوں پر کان دھرتا ہے تو اندر خاموشی چھا جاتی ہے۔ یہی چڑیا کے ساتھ ہوا۔ اندر خاموشی تھی اور باہر ہر طرح کی آوازیں۔ مگر سوال یہ تھا کہ باہر کہاں ہے۔ وہ کھلا آسمان کہاں ہے۔ وہ میرے اپنے کہاں ہیں۔ اور وہ پرندے۔ اور وہ ہوا۔!!

ابھی کچھ دیر پہلے تو سب کچھ تھا اور اب کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر چڑیا کیا جانتی ان باتوں کو کہ کچھ دیر پہلے تو سب کچھ ہوتا ہے مگر پھر نقش بن جاتا ہے۔ تصویر ہو جاتا ہے۔ خیال رہ جاتا ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے کہ وہ جو کچھ دیر پہلے سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ بعد میں کیوں نہیں ہوتا۔

وہ بعد میں کیوں نہیں ہوتا۔؟ چڑیا نے پھراڑان لی۔ پھر بلند ہوئی۔ اسے راستے کی تلاش تھی۔ اسے باہر جانا تھا۔ یوں ہی چکراتی پھری۔ بہت دیر تک کہیں راستہ نہ تھا۔ مگر پھر اچانک راستہ بھی دکھائی دے گیا۔ وہی روشندان جس سے کہ وہ داخل ہوئی تھی۔ وہی تو راستہ تھا۔

وہی تو راستہ تھا۔ وہی بند روشندان کہ جس میں ایک شفاف شیشہ نصب تھا اور باہر منتظر صاف دکھائی دیتے تھے۔ وہ سرشار ہوکر پر جھلاتی آگے بڑھی اور اڑتی ہوئی گویا باہر نکل جاتی کہ اچانک شیشے سے ٹکرائی اور گرتے گرتے بچی۔ یہ آخر کیا ہوا تھا وہ سنبھلی تو ایک طرف دیوار کے کسی ابھرے ہوئے چھجے پر پاؤں ٹکا کر روشندان کو دیکھنے لگی۔

تھا تو وہ راستہ۔ نظر جو سب کچھ آتا تھا۔ سامنے کھلی فضا کے منظر تھے۔ پرندے اڑتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ پتے جھولتے تالیاں بجاتے تھے۔ پھر آخر وہ ٹکرائی کس چیز سے۔ باہر کیوں نہ نکل پائی؟۔ ایک کوشش اور کرنی چاہیے۔ تو اس نے ایک کوشش اور کی۔ ایک اور۔ ایک اور اور پھر بار بار۔ مگر ہر بار اسی شفاف شیشے سے ٹکرا کر رہ جاتی جو روشندان میں لگا تھا۔ تو یہ دیوار ہر بار کہاں سے آ جاتی تھی جو اس کے اور کھلی فضا کے درمیان کھنچی تھی۔ وہ حیران تھی۔

کمرے کے وسط میں سوئی پڑی عورت نے خواب میں اسے دیکھااور خوب محفوظ ہوئی۔ وہ اس کی ناسمجھی پر ہنستی رہی۔ ہنستی رہی۔ مگر پھر پریشان ہوئی۔ اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ پٹ وا کر دیئے اور اپنا پلو جھلا جھلا کر اسے اڑانے اور باہر دھکیلنے کے عمل میں مبتلا ہوگئی۔ مگر حیرت کامقام تھا...........................!

حیرت کامقام تھا کہ دروازہ بھی کھلا تھا۔ مگر چڑیا اس کے پلو جھلانے پر بدحواسی میں کمرے میں ادھر ادھر تو اڑتی۔ مگر کھلے دروازے سے باہر نہ نکلتی۔ اس کا ہرمرتبہ رخ اسی روشندان کی طرف ہوتا کہ جس میں شیشے کی دیوار تھی۔ معلوم نہیں یہ بات اس کے ذہن میں کیوں سماگئی تھی کہ بس یہی ایک راستہ ہے۔ اور یہ جو کھلا دروازہ ہے محض ایک چال ہے۔ یا پھر کوئی جال ہے۔

اور عورت سوچتی تھی کہ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ راستہ موجود ہوتا ہے اور سامنے دکھائی دیتا ہے مگر اس سے باہر نکلنے میں کوئی ڈر مانع ہوتا ہے اور ہر بار اسی راستے کی طرف قدم کیوں بڑھتے ہیں کہ جو بظاہر کھلا ہوتا ہے مگر در حقیقت خواب ہوتا ہے یا پھر ایک شیشے کی دیوار ہوتی ہے۔ جس کے پار جھانکا تو جاسکتا ہے۔ نکلا نہیں جاسکتا۔ تو یہ ساری باتیں اس نے اپنے خواب سے جھانکتے ہوئے سوچیں اور پھر پلو جھلاتی کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔

وہ عورت باہر نکل گئی چڑیا کو اندر بند کمرے میں چھوڑ کر اور ڈھونڈتی پھری اس سب کو جو کچھ دیر پہلے ہوتا ہے اور پھر بعد میں نہیں ہوتا۔ اور باہر ابھی تک ایک طوفان تھا۔ ہوا کے بڑے بڑے مرغولے سب کو بلندی پر لے گئے تھے۔ سب بیتے ہوئے دنوں کو' سب چہروں کو' سب باتوں کو۔ ہر چیز گردش میں تھی اور بے بس تھی مگر مصور کو سائبان مل گیا تھااور وہ بڑے انہماک سے تصویر بنانے میں مصروف ہوگیا تھا۔

یہ تو میری تصویر ہے عورت نے دیکھا اور خیال کیا۔ میری آنکھیں اور میرے خواب۔ تو خواب کا منظر بڑا دلکش تھا۔ کھلا نیلا آسمان۔ اور اس کے کھلے ہوئے پنکھ۔ اور نیچے۔ بہت نیچے بونوں جیسے آدمی۔ چھوٹے چھوٹے۔ ہاتھ بڑھاکر اسے اچکنے کی ناکام کوششوں میں مصروف اور وہ اڑتی پھرتی گیت گاتی۔

وہ تو اڑتی پھرتی گیت گاتی رہی مگر چڑیا کو کمرے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ ملا اور دن سنولا گیا۔

جب دن سنولا گیا اور شام ہوگئی تو وہ چڑیا روشندان میں لگی لوہے کی سلاخ پر قدم جماکر بیٹھ گئی۔ تھکن اور مایوسی میں اس کے پر لٹکے ہوئے تھے۔ منہ کھلا تھااور وہ بڑ بڑ باہر کے منظروں کو دیکھ رہی تھی۔ اب ہوا میں وہ زور نہیں رہا تھا۔ پرندے واپسی کے سفر پر تھے اور غول در غول ادھر ادھر اپنے اپنے ٹھکانوں کو جاتے دکھائی دیتے تھے۔ وہ دیکھتی رہی اور اندھیرا بڑھتا رہا۔ پھر تاریکی چھاگئی۔ عورت نے کروٹ لی اور اپنے خواب کو اور بھی مضبوطی سے اوڑھ لیا۔ چڑیا نے سر نہوڑایا اور اپنے پروں میں چھپالیا۔

وہ سرپھری ہوا کادن اور وہ سرپھری ہوا کی رات دونوں گزر گئے اور اگلا دن آگیا۔

سپیدی نمودار ہوئی۔ اب موسم پر سکون تھا۔ سرپھری ہوا نے جو کھیل کھیلنا تھا وہ کھیل چکی تھی اور مصور بھی اپنے کام سے فارغ تھا۔

مصور اپنے کام سے فارغ تو تھا مگر کینوس کے آگے حیرت میں مبتلا بت بنا تھا۔ اس نے اپنی تصویر میں جس عورت کو نیلے آسمان پر پنکھ پھیلائے اڑتے پھرتے گیت گاتے دکھایا تھا وہ تصویر میں اب موجود نہیں تھی غالباً" تاحال بے خبر سوئی پڑی تھی اور جو وحشت زدہ چڑیا بنائی تھی وہ بھی اب نہیں تھی۔ شاید کہیں فرش پر گری پڑی تھی اور اس کے مردہ وجود کو کیڑے مکوڑوں نے گھیر رکھا تھا۔ یا پھر وہ سوئی ہوئی عورت کے خواب میں شامل ہوگئی تھی اور واپسی کا راستہ بھول گئی تھی۔ کچھ بھی تھا مصور اپنے خالی کینوس کے آگے عجب مخمضے میں تھا کہ کیا اس نے کوئی تصویر بنائی بھی تھی یا* محض سوچتا خیال کرتا رہ گیا تھا.................. چڑیاں پھر اس کے چاروں طرف چہچہانے لگی تھیں۔

جنگل
جانور
آدمی

اسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ وہ کب لوگوں کے ہجوم سے نکلا اور کب جنگل میں داخل ہوا۔ وہ ہجوم میں تھا کہ دھکم پیل ہوئی۔ بھگدڑ مچی۔ پھر ایک ریلا ایسا آیا کہ سب منظر بدل گئے۔ اور قدم ایک اور ہی ڈگر پر آگئے۔

اتنے لوگ جانے کہاں سے آگئے تھے۔ سڑکوں پر اور گلیوں میں۔ ہر طرف آدمی ہی آدمی سر اور پاؤں اور ہاتھ اور آنکھیں۔ آدمی ہی آدمی۔ شور۔ بلا کا شور۔ اتنے آدمی کہاں سے آگئے تھے۔ یا پھر وہ اتنے آدمیوں میں کہاں سے آگیا تھا۔ دم گھٹنے لگا تھا۔ سانس رکنے لگی تھی۔ مگر چلنا پڑ رہا تھا۔ بس چلتے رہو۔ نہیں چلو گے تو ہجوم گراتے ہوئے کچلتے ہوئے روندتے ہوئے گزر جائے گا۔ بس ایسا ہی عالم تھا۔

بس ایسا ہی عالم تھا اور کوئی راستہ ہجوم سے باہر نکلنے کا دکھائی ہی نہیں دیتا تھا۔ مگر پھر شہر روپوش ہوا۔ نہ سڑکیں تھیں گلیاں نہ لوگ۔ بس پیڑ۔ قطار اندر قطار پیڑ ہی پیڑ۔ اک جنگل جھاڑ جھنکار سے بھرا ہوا جنگل۔

تو وہ جنگل میں آگیا تھا۔ بس آپ ہی آپ۔ مگر وہ کوئی فقیر یا سادھو تو نہیں تھا کہ وہاں کٹیا ڈال کے پڑ رہتا۔ نہ کوئی جانور تھا کہ کسی کھوہ کچھار میں سر چھپا لیتا۔ آدمی تھا۔ بس اسی پہ اطمینان کیا تھا کہ لوگوں کے اس بے طرح ہجوم سے تو الگ ہوا جو جان کو آگیا تھا۔ کچھ ستاتا اور پھر گھر کی راہ لیتا۔ مگر وہ جنگل میں کیسے پہنچا۔

یہ سوال اہم تھا مگر زیادہ اہم یہ تھا کہ یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ کہاں ہے۔ گھر کی راہ لینے میں ہی عافیت ہوتی ہے ورنہ جنگل میں آؤ تو یار بنے بسنے کی خواہش لے کر آؤ یا شکار کی غرض سے آؤ۔ پھر لوٹ جاؤ۔ تو اسے لوٹ جانا تھا۔ مگر جنگل گھنا جنگل اس کے اندر داخل

ہو رہا تھا- ہاں ایسا ہی تھا- ہاں ایسا ہی ہوتا ہے- جب جنگل میں داخل ہو جاؤ- تو جوں جوں آگے جاؤ گے جنگل خود تمہارے اندر داخل ہونے لگے لگا- باہر راستہ بھولو گے تو اندر بھی گم ہو جاؤ گے-

وہ راستہ تو نہیں بھولا تھا مگر راستے نے اسے فراموش کر دیا تھا- جنگل کی راہ اس نے آپ کب لی تھی- ہجوم نے دھکیل کر اس راستے پہ ڈال دیا تھا- اب وہ آگے بھی جاتا تھا اور پیچھے بھی- مگر ہر طرف جنگل تھا- پیڑ تھے- گھنے پیڑ- اور پرندوں اور جانوروں کا شور تھا- راستہ تو کہیں بھی نہیں تھا-

ابھی دن نہیں ڈھلا تھا مگر پھر دن بھی ڈھل گیا- شام ہو گئی- پرندوں کا شور بڑھتا گیا- وہ واپسی کے سفر پر تھے- اور واپسی کے سفر پر تھے جانور- اور وہ ایک درخت کی اوٹ میں چھپا بیٹھا تھا- اس انتظار میں کہ جب سب کی واپسی ہو چکے تو وہ بھی واپسی کا سفر اختیار کرے اور اپنے راستے پر آجائے- مگر جب رات ہوئی اور تاریکی نے سب کو اپنی چادر میں سمیٹ لیا تو پھر کہاں کا راستہ- ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا- راستہ کیسے دکھائی دیتا-

اب خوفزدہ ہو جانے میں کچھ مضائقہ نہ تھا- جنگل سے ڈرنا چاہئے- اس میں بسنے والے ہر نوع کے درندوں سے سانپوں سے اور زہریلے کیڑوں سے- اور اس رات سے جو جنگل میں آجائے- اس نے محسوس کیا کہ اس پر کپکپی طاری ہے اور وجود میں سنسنی دوڑتی ہے- ڈرنا چاہئے- وہ ڈر رہا تھا اور رات ڈھل رہی تھی- جوں جوں رات ڈھلتی گئی سناٹا ہوتا گیا- پرندوں نے تو درختوں پر بسیرا کرتے ہی بولنا ترک کر دیا تھا بس کہیں کہیں چہل پہل تھی- درندوں کا بھی بولنا بند تھا بس کوئی کوئی صدا تھی- مگر وہ ڈر رہا تھا- کہ اگرچہ کچھ چپ سی تھی مگر وہ سانس بھی لے گا تو اسکی آہٹ پاکر سارا جنگل بولے گا اور حملہ آور ہو جائے گا- تو وہ دم سادھے بیٹھا رہا کہ جنگل میں رات آگئی تھی-

جنگل کی رات تھی اور اونگھنے کا بھی مقام نہیں تھا بس آنکھیں کھلی رکھنے اور کان کسی چاپ پر لگائے رکھنے میں عافیت تھی- اور وہ اسی عافیت کو اوڑھے ہوئے ایک جھاڑی کی اوٹ میں چھپا بیٹھا تھا مگر مستعد تھا جب اچانک اس نے محسوس کیا کہ ہر طرح کی اتھل

چھل، پتوں کی کھڑکھڑاہٹ رک گئی ہے۔ ہوا بھی تھم چلی ہے اور غیر محسوس سا سناٹا پھیل گیا ہے۔ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جنگل کا جنگل ہر طرح کے پرندوں درندوں اور کیڑے مکوڑوں سے خالی ہوگیا ہے اب صرف پیڑ رہ گئے ہیں جو اپنے اپنے مقام پر ایستادہ ہیں باقی کوئی آواز نہیں رہی۔ تو یہ یکلخت کیا ہوگیا تھا۔ اس کے سارے مساموں نے پسینہ اگل دیا۔ یہ کیسی خاموشی ہوگئی تھی۔ حالانکہ اسے خاموشی درکار تھی۔ مگر ایسی پراسرار بھی نہیں کہ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ کیا کسی طوفان کی آمد ہے؟ ــــ مگر نہیں ایسا نہیں تھا۔ اچانک ایک قریب کے درخت میں حرکت ہوئی۔ کوئی سایہ سا لہرایا۔ کوئی پنجوں کے بل اکڑوں چلتا ہوا پاس سے نکل گیا اور کہیں روپوش ہوگیا۔ کیا کوئی آدمی تھا ــــ؟ مگر نہیں اس کے سوا اور کوئی دوسرا آدمی یہاں کہاں؟ ــــ کوئی جانور ہوگا۔ کوئی بے ضرر جانور جو خود چھپتا پھرتا ہوگا۔ یا وحشی درندہ جو اس سے بے خبر اپنے راستے پر ہولیا ہوگا۔ یا گھات لگانے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش میں ہوگا۔ وہ اور بھی ڈر گیا۔ اپنے آپ میں دبک گیا۔ رات کچھ اور گزر گئی۔

جب رات کچھ اور گزر گئی تو پھر اس نے کچھ پر اسرار سا محسوس کیا۔ پاس ہی کہیں پھر کسی آدمی کا ہیولا دکھائی دیا۔ پھر سرگوشی سی بھی ہوئی۔ جیسے کسی نے قریب آکر کان میں کچھ کہنا چاہا ہو۔ وہ آدمی ہی تھا۔ اسے یقین سا ہوا۔ گردن اٹھا کر دیکھا۔ مگر جدھر وہ گیا تھا۔ ادھر ایک بوڑھا پیڑ تھا ...... ادھر ہی نہیں چاروں طرف پیڑ تھے......... زمین کے اندر دھنسے ہوئے بوڑھے اور جوان پیڑ مگر سرگوشی تو ہوئی تھی......... ہو سکتا ہے وہم ہی ہو...... وہم نہین تھا آدمی تھا جو اچانک سامنے آیا تھا......... وہ بھونچکا سا اٹھ کھڑا ہوا اسے دیکھتا ہوا مگر تاریکی میں اس کا ہیولا پھر تحلیل ہوگیا۔ مگر ثابت ہوگیا کہ وہ آدمی تھا۔ مگر کہاں تھا ـ دل نے چاہا کہ صدا کر کے پوچھ لیا جائے مگر جنگل ویرانہ تھا۔ درندوں کا ڈر تھا۔ اس نے نہیں پوچھا۔

اس نے نہیں پوچھا۔ مگر جلد ہی محسوس ہوا کہ ایک نہیں کئی آدمی ہیں جو اس کے ارد گرد منڈلاتے پھر رہے ہیں۔ کیا کوئی آسیب ہے؟ اس نے سوچا اور خوف سے کپکپا گیا۔ کوئی دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔ جب آہٹیں بہت بڑھ گئیں اور ہیولے بھی اور سرگوشیاں بھی تو وہ اپنی

جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جو ہیولا اب اسے دکھائی دیا وہ اس کی طرف لپکا مگر ایک درخت سے ٹکرا کر رہ گیا۔ اور وہیں اس درخت کے ساتھ پشت لگا کر ڈھیر ہوگیا۔ تو جب وہ ڈھیر ہوگیااور کچھ دیر اسی طرح گزر گئی تو اس نے محسوس کیا۔ بلکہ اپنی سماعتوں میں خود کسی آواز کی گونج سنی۔ کسی نے کہا۔ کوئی ہے جو ہمیں خرید کر آزاد کردے۔ وہ اس صدا پر بری طرح چونکا.......... یہ کیسی صدا تھی؟۔ یہ کون بولا تھا؟ مڑ کر دیکھا اور حیرت سے مجسمہ بن کر رہ گیا...... وہ جس سے اپنی پشت لگائے بیٹھا تھا وہ پیڑ نہیں تھا آدمی تھا...... اور اسی نے سرگوشی کی تھی ...... وہ ہڑ بڑا کر تیزی سے الگ ہوا..... اور بھاگ کر ایک درخت کی اوٹ میں چلا گیا۔ یہ عجب ماجرا تھا۔ وہ کن کے درمیان تھا درختوں کے یا آدمیوں کے۔ یہ جنگل تھا یا شہر۔ اور یہ کیسی صدا تھی ؟

وہ سوچتا رہا مگر زیادہ دیر نہیں کہ یہ عجب سی سرگوشی پھر ہر مرتبہ ہوئی۔ ہر پیڑ میں حرکت تھی۔ ہر پیڑ بولتا تھا۔ گویا ہر پیڑ آدمی تھا۔ یا ہر آدمی پیڑ تھا۔

تو وہ بولایا ہوا باؤلا سا ادھر ادھر جنگل میں مارا مارا بھاگتا پھر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اچانک ہوا۔ ہر پیڑ آدمی بن گیا یہ وہم نہیں تھا بس ایسا ہی ہوا تھا۔ سرگوشیاں تھیں۔ پھر وہ صدائیں بنیں اور اب نعرے تھے جو چاروں طرف گونج رہے تھے۔ ہر کوئی اس سے مخاطب تھا۔ کوئی ہے جو ہمیں خرید کر آزاد کردے۔ سارا جنگل تکلیف میں تھا۔

تو جب وہ شہر میں تھا تو لوگوں کے ہجوم مین تھا۔ ہر طرف دھکم پیل تھی۔ افراتفری تھی۔ چلنا پڑ رہا تھا۔ گھسٹنا پڑ رہاتھا۔ بھاگنا پڑ رہاتھا۔ پھر ایک ریلا ایسا بھی آیاکہ جنگل میں پھینک گیا۔ اور جنگل میں پیڑ تھے آدمی نہ تھے۔ اپنی جگہ پر ایستادہ۔ لیکن اب معلوم ہواکہ جنگل بھی بولتا ہے اور پیڑ جب چاہتے ہیں آدمی بن جاتے ہیں۔ تو وہ آدمی بن گئے تھے اور ایک ہجوم ہوگیاتھا۔ جو اس کے گرد اکٹھا تھا اس سے مخاطب تھا۔ طلبگار تھا۔ کوئی ہے جو ہمیں خرید کر آزاد کردے۔ وہ ان میں پھنسا ہوا تھا۔ مگر رات ڈھل رہی تھی۔

رات کو ڈھلنا ہوتا ہے۔ صبح طلوع ہوتی ہے۔ تو رات ڈھل گئی اور سپیدہ سحر نمودار ہوا۔ تو جب سپیدہ سحر نمودار ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ جنگل میں نہیں ہے کہیں کسی راستے پر

ہے۔ تو وہ پیڑ کہاں گئے۔ کیا سب کٹ گئے۔ یا آدمی بن کے رخصت ہو گئے۔ اور وہ سرگوشیاں۔ کچھ بھی نہ تھا۔ اور نیلا آسمان تھا۔ اور نیچے سخت کرخت زمین۔ اور اس کا کچلا ہوا روندا ہوا جسم جیسے کوئی ہجوم اسے گراتا روندتا اور کچلتا ہوا گزر گیا ہو۔ کہیں کوئی پیڑ نہیں تھا کہیں کوئی ہجوم نہیں تھا۔ سوائے اس ایک خستہ حال بوڑھے کے کہ جس کے گلے میں اسی کی طرح کا طوق تھا اور ناک میں نکیل تھی اور وہ دونوں ہاتھ اٹھائے اس پر جھکا بیٹھا واویلا کر رہا تھا۔ "کوئی ہے جو اسے خرید کر آزاد کر دے کہ اب یہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا۔"

.... تو وہ آدمی تھا اور آدمیوں کے درمیان کچلا ہوا روندا ہوا گرا پڑا تھا۔

آراء

احمد جاوید کا لہجہ نہ صرف مختلف اور اثر انگیز ہے بلکہ افسانے کی پوری روایت میں یہ لہجہ ایک علیحدہ اور جاندار مقام کا تعین کرے گا۔ احمد جاوید کی کہانیوں میں لفظ کا استعمال سروں کی نشست و برخاست کی طرح ہمیں ایک کلاسیکی ردھم (RHYTHM) کی موجودگی کا احساس دلاتا ہے جو اس کی کہانیوں کو (READABLE) سے کہیں آگے کی چیز بنا دیتا ہے۔

(ابرار احمد ...... ایک نئے لہجے کی دریافت۔ "سویرا" برمنگھم ۱۹۸۴)

احمد جاوید اپنے ہم عصروں میں بالکل مختلف ہے۔ وہ افسانے میں نہ تو انٹیلکچوئل پوز کرنا پسند کرتا ہے اور نہ ہی کوئی فلسفہ بکھیر کر قاری پہ بوجھ بنتا ہے۔ وہ ایک باشعور کہانی کار ہے اور کہانی اس کو الگ شناخت کراتی ہے......................

.... تہہ داری اور رمزیت سے نفسی محرکات کا اظہار احمد جاوید کی فنی بصیرت اور آگہی کا ثبوت ہے۔ اس کے ہاں موضوع کی صداقت، عصری آگہی اور شعور موجود ہے۔ اسی لئے اس کے ہاں یاسیت اور درد انگیزی محض غم اور درد بن کر نہیں رہ جاتی ہے۔ اندوہناک حالات میں اپنے لئے جینے کا سلیقہ تلاش کر لیتی ہے۔ اس کا فنی مشاہدہ اور تجربہ گہرائی کا اور اک، واقعہ، کردار، ماحول و منظر کے اظہار میں اختصار اور جامعیت سے ابھرتا ہوا اسلوب اس کی شناخت بن رہا ہے۔ پیش کش میں ایک سلیقہ اور فکر و نظر کا توازن اس کے ہاں فیاض ہے۔

(ڈاکٹر اعجاز راہی "الفاظ" کراچی ۸۴)

احمد جاوید کے سامنے زندگی اسٹل لائف کی صورت آشکار ہوئی ہے۔ احمد جاوید نے اس وژن سے آنکھیں نہیں چرائیں۔ اسے افسانوی فارمولوں اور فیشن میں ڈھالنے کی کوشش،

نہیں کی۔ صرف اس منظر کو اپنے خوابوں اور فینٹسی سمیت پینٹ کر دیا ہے۔ مانوس ہونے کے باوجود یہ منظر نظر پر بار نہیں بنتے۔ تھمے ہوئے مناظر سانس لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی احمد جاوید کی انفرادیت ہے۔

(انور خان - "جواز" مالیگاؤں بھارت)

احمد جاوید اس معاشرے کا (ODDMAN OUT) ہے۔ وہ ان پرندوں کا ساتھی ہے جنہیں زمین قبول نہیں کرتی اور جو مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔ احمد جاوید نے زندگی کا بیانیہ مرتب کرنے کی بجائے مشاہدے کی کوکھ سے متعدد سوالات ابھارے ہیں اور اس کائی کو کریدنے کی کوشش کی ہے جو نسل در نسل ذہنوں پر دبیز تہہ کی طرح جمتی چلی جاتی ہے۔ احمد جاوید نے روایتی اسلوب سے ہٹ کر یہ کہانیاں لکھی ہیں۔ اور یہ کسی ٹھوس حقیقت کو آشکار کرنے کی بجائے آپ کو فکری سطح پر تموج آشنا کرتی اور تمثیلی طور پر آپ کو متن کے پس پردہ جھانکنے کی دعوت دیتی ہیں۔

(ڈاکٹر انور سدید- "اوراق" لاہور مارچ اپریل ۱۹۸۴ء)

اردو کی جدید تر کہانی کا منظر نامہ احمد جاوید کے نام سے ایک نئی جہت لے کر سامنے آتا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے افسانہ نگاروں کے درمیان احمد جاوید نے نئی کہانی میں نئے امیجز اور نئی متحرک تصویریں قاری کو دی ہیں۔ وہ اپنی کہانی پر علامت نگاری کا لیبل چسپاں نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہ ایک مفرد کہانی کار ہے۔ ایسا کہ آس پاس اس جیسا کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ وہ اپنی کہانی کی ایک ایک تار خود کاتتا اور بنتا ہے۔

(پروین ملک- "ماہ نو" لاہور)

اس دور میں جبکہ دن کی سچائیاں رات کا جھوٹ اور رات کا سچ دن کا جھوٹ ہو اور جہاں سچ کی اشاعت محض حصول جاہ تک ہو وہاں انتہائی کڑا اور کڑوا سچ لکھنے والے ادیبوں کی ذہنی جھنجھناہٹوں اور نفسیاتی کیفیتوں کا جائزہ بھی ایک ضروری امر ہوتا ہے۔ اس دور کے چند ہی ادیب .... ایسے ہیں جنہوں نے بدبختی کے اس عرصہ میں بنیادی صداقتوں کا دامن ہر قیمت اور ہر الزام .... کے باوجود تھامے رکھا ....

.... احمد جاوید کے افسانوں کے مجموعے "غیر علامتی کہانی" کا ذکر تو آمر اعلی نے ادبی کانفرنس میں کر دیا تھا۔

(داؤد رضوان "فنون" لاہور جنوری اپریل ۹۳)

احمد جاوید کے اسلوب میں کیمرہ تکنیک کو نمایاں حیثیت حاصل ہے وہ منظر کو کھولتا چلا جاتا ہے اور بیان میں پرانے داستان گو جیسی وسعت کے ساتھ قاری کے ذہن میں تاثر کی تصویریں بنتی چلی جاتی ہیں اس اسلوب میں لفظوں کی تکرار .... منظر کی دہرائی اور ایک کیفیت کو متعدد بار زور دے کر بیان کرنا وہ خاص انداز ہے جس سے احمد جاوید کے اسلوب کی انفرادیت قائم ہوتی ہے۔

(ڈاکٹر رشید امجد کہانی کا غیر علامتی رویہ - یافت دریافت)

فرانز فینن کی طرح احمد جاوید کے افسانوں کا موضوع بھی روندے اور کچلے ہوئے وہ لوگ ہیں جو صدیوں سے پامال ہوتے آرہے ہیں .... آریاؤں کے دور سے لے کر اب تک احمد جاوید کی دانست میں پامالی کا یہ سلسلہ ٹوٹا نہیں۔

(ڈاکٹر غلام حسین اظہر فنون لاہور ۱۹۸۴ء)

احمد جاوید کی کہانی میں انفرادی اور اجتماعی سطح کے ملے جلے علامتی اشارے ابہام اور تجرید سے بچ نکلتے ہیں کیونکہ کہانی کا سیاق و سباق ان کے مفہوم کو متعین کرتا چلا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اشارہ و کنایہ جو حسن پیدا کرتا ہے یا عبارت میں اس سے جو کاٹ پیدا ہوتی ہے وہ موجود رہتی ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ احمد جاوید نے علامت کو استعمال کیا ہے۔ علامت نے احمد جاوید کو استعمال نہیں کیا۔

(ڈاکٹر سعد اللہ کلیم اوراق لاہور ۱۹۸۴ء)

احمد جاوید نے موجودہ معاشرے کی پر تضاد صورت حال کو عریاں کرنے کے لئے اپنے افسانوں کو محدب شیشے میں تبدیل کر لیا ہے۔ وہ اسلوب میں امیجز پر خصوصی توجہ دیتا ہے اس طرح غیر ضروری تفصیلات سے بھی بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر "نوائے وقت" راولپنڈی)

احمد جاوید کے افسانوں میں زندگی کے خواب کی تعبیر، تفسیر مغرب سے درآمد شدہ افکار و نظریات کے دھندلکوں میں روپوش نہیں ہے۔ ان کا انداز تحریر کہیں سنجیدہ کہیں حقیقت کی تلخی لئے اور کہیں طنز کی گہری کاٹ رکھتا ہے۔

ان کے افسانوں میں پلاٹ یا کہانی کی منطقی ترتیب نہیں ہے۔ غیر مربوط خیالات یا خارجی مناظر افسانے میں اس طرح ابھرتے ہیں کہ افسانے کی تکمیل تک کسی نہ کسی بنیادی خیال کی مرتب حالت ضرور سامنے آتی ہے۔ ان کی تحریر میں صوتی آہنگ اور معنویت پیدا ہو کر ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اس پر آزاد شاعری کا گمان ہونے لگتا ہے۔ یہ افسانہ نگاری میں ایک نیا اسلوب ہے جو بھلا لگتا ہے اور افسانوں میں حقائق کی تلخی کے باوجود حلاوت اور ادبی حسن پیدا کرتا ہے۔

(ڈاکٹر فردوس انور قاضی۔ "اردو افسانہ نگاری کے رجحانات" مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۰ء)

غیر علامتی کہانی میں پورے ادبی حسن کے ساتھ عہد آمریت کی مادی اور ذہنی جبر سے پیدا ہونے والی خارجی اور داخلی کیفیات کو پیش کرتے ہوئے قومی اور سماجی اور انفرادی آزادی کی امنگوں کو تخلیقی انداز میں ابھارا گیا ہے .... افسانے آثار کا اختتامیہ دیکھئے۔

"میں آسمان کی طرف دیکھتا ہوں اور پھر ادھر ادھر لوگوں کو لیکن لوگ اپنے اپنے کام میں لگے ہیں۔ پسینہ بہہ رہا ہے مگر سر نہیں اٹھاتے........." ص (۳۳)

اسی طرح ایک اور افسانے "غیر علامتی کہانی۔۲ کے آخری جملے بھی کتنے تہہ دار ہیں کہ:
"لکھتا ہوں اور کاٹتا ہوں .... کاٹتا ہوں اور لکھتا ہوں مگر یہ آسیب زدہ رات کچھ ایسی طویل ہے نہ لکھی جاتی ہے نہ کاٹی جاتی ہے......" (ص ۳۶)

ایسی ہی تہہ داری ان کے اکثر افسانوں میں موجود ہے جو ان کے افسانوں کو پاکستان کی مخصوص عصری صورت حال کے اظہار تک محدود نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے شامل رکھتے ہوئے انہیں وسیع تر عصری حسیت کا تخلیقی ترجمان بنا دیتی ہے۔

(یوسف حسن، فنون لاہور جنوری اپریل ۹۳)
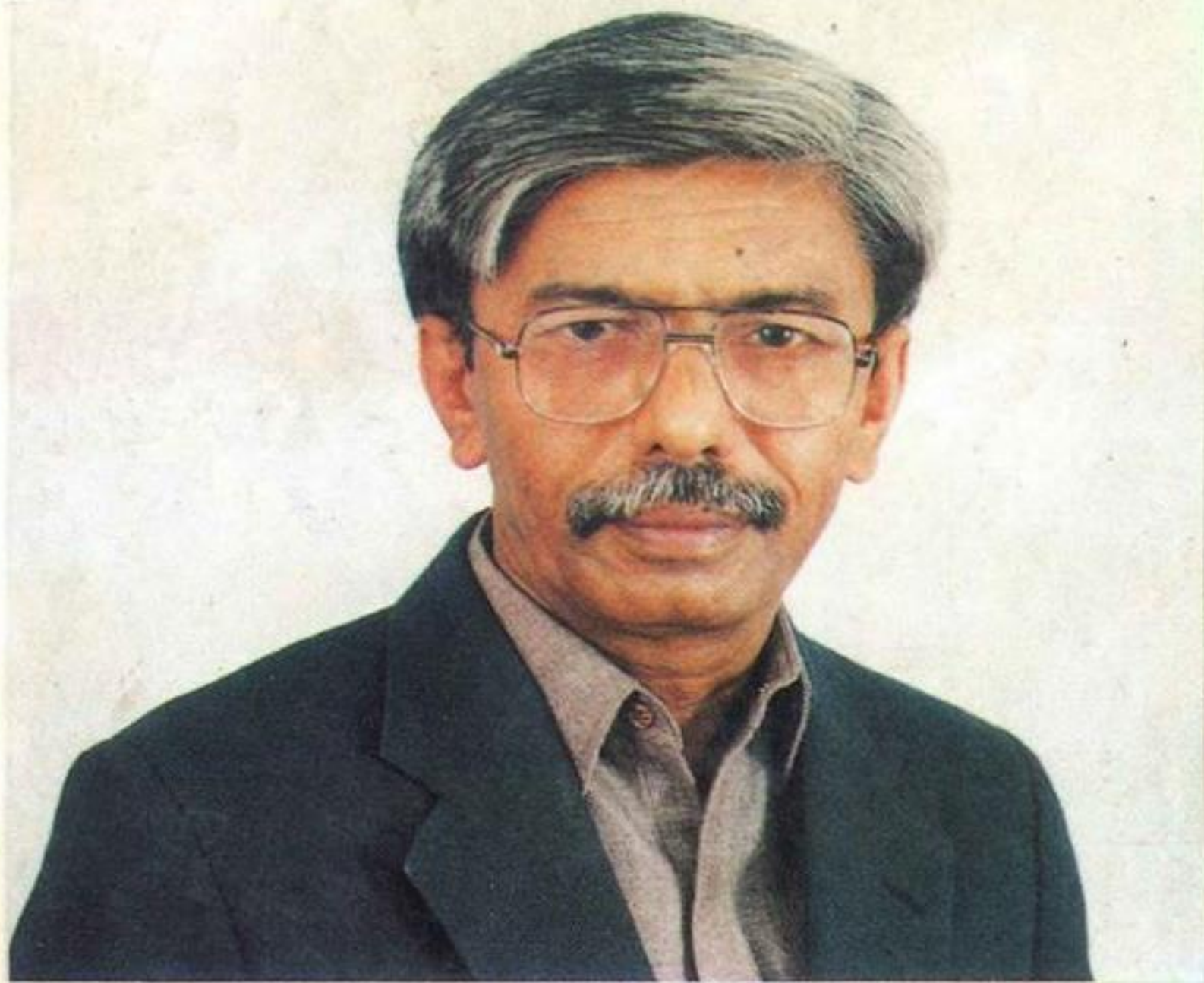
Ahmed Javed's presentation of human life is nothing but truth, even stark truth. He states what happens and what has earlier happened, essentially the job of a historian, and embellishes it with his creative vision. He talks in detail about the concrete particulars of existence in a part of the world but while dealing with the particular happenings he manages to escape from being subject to the tyranny of facts by relating them to the universal features and tendencies of life. He takes a larger and generalised view of life. He represents the universal in and through the particular and thus shares in the philosopher's quest for ultimate truth. The facts of life acquire a new value as they appear in his world of creation.

Prof. Muhammad Akram
Daily "The Muslim" Jan 29, 1993

GANDHARA